تذکارِ محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بلغ العلیٰ بکمالہ

کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلوا علیہ وآلہ

مرتبہ

حکیم محمد سعید

تذکارِ محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مرتبہ

حکیم محمد سعید

ہمدرد اکیڈمی ، کراچی ۱۸

تذکارِ محمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

اشاعتِ اوّل : ربیع الاوّل ۱۳۹۲ ہجری - اپریل ۱۹۷۲ شمسی

ناشر : ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (پاکستان)، کراچی

کتابت : خواجہ محمّد شفیع، غلام مصطفےٰ خاں

طباعت : زین پیکیجنگ انڈسٹریز، کراچی

قیمت : چھے روپے

ترتیب

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

سرکارِ دو عالم، فخرِ موجودات، سرورِ کونین، ختم الرسل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیّبہ اور حیاتِ پاک ہر مسلمان کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں ہر قدم پر، ہر شعبۂ زندگی میں سرکارؐ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضورؐ نے حیاتِ انسانی کے ہر شعبے، ہر گوشے میں مکمّل ہدایات اور مثالی اعمال کے ذریعہ ہمیں سیدھا، سچّا، صاف، روشن اور بہترین راستہ بنایا ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ پاک پر جتنا لکھا گیا ہے دنیا کی کسی اور شخصیت پر اتنا نہیں لکھا گیا، لیکن سیرتِ طیّبہ ایک بحرِ زخّار ہے اور اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔

مئی ۱۹۷۰ء میں شامِ ہمدرد تذکارِ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف تھی اور ملک کے بہترین دماغوں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ مجموعہ انھی کے افکار پر مشتمل ہے۔ اس محفلِ مقدس میں شریک ہر دانش ور نے سیرت کا مطالعہ کسی خاص حیثیت میں کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو میں قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے امید وار ہوں کہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام مسلمانوں کو اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائیں۔ اسی تمنّا میں یہ مجموعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

حضرت مولانا مفتی محمّد شفیع صاحب مدظلہٗ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں کہ آنمحترم نے میری درخواست پر تقریظی کلمات تحریر فرمائے۔

جن حضرات کے افکار اس کتاب میں شامل ہیں اُن کا اور اُن رفقا کا جنھوں نے اس سلسلے میں تعاون کیا ممنون ہوں اور اُن کے لیے دعائے سعادت کرتا ہوں۔

حکیم محمّد سعید

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ

محترم حکیم محمد سعید صاحب ہمدرد کو حق تعالیٰ نے خدمتِ خلق اور مفید عام کاموں کی جو توفیق بخشی ہے شاید کوئی پاکستانی اُس سے ناواقف نہ ہوگا۔ خصوصاً طبِّ یُونانی کو اس کی کس مپرسی اور دم توڑنے کے وقت میں آپ ہی کی مساعیٔ جمیلہ نے اس درجے میں پہنچا دیا کہ مغربی ڈاکٹری کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ کام پاکستان کے اقتصادی حالات کی درستی اور کم از کم علاج معالجے میں اس کے خود کفیل ہونے کی طرف بہت موثر قدم ہے۔ دینی اسلامی حیثیت سے دیکھا جائے تو طبِّ یونانی پر ائمۂ اسلام اور ماہرینِ طب مسلمانوں نے جتنا کام کر کے اُس کو بامِ بلند پہنچایا اُس کی وجہ سے اس کو طبِّ اسلامی کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ ان کاموں پر آپ کی شبانہ روز اور غیر معمولی محنت شاقہ حیرت انگیز صورت سے جاری ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مساعیٔ جمیلہ کو ہمیشہ عافیت کے ساتھ جاری رکھیں۔

اس کے ساتھ ہی حال میں آپ نے "شامِ ہمدرد" کے ذریعہ نبی الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ کے خاص خاص اہم گوشوں پر ملک کے مشاہیر کے مضامین کا ایک ذخیرہ بنام "تذکارِ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم" جمع فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اپنی مسلسل بیماریوں اور ضعفِ عمر کے باعث ان مضامین کو دیکھ نہ سکا، مگر اس مبارک کام میں حصّہ لینے کو ایک سعادت سمجھ کر کلماتِ ذیل لکھ رہا ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم دُنیا میں آخری پیغمبر کی حیثیت سے تمام علمی عملی کمالات کے جامع اور انسانِ کامل کا ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ نے اُمت کو صرف عبادات و عقائد ہی کی تلقین نہیں فرمائی بلکہ زندگی کے ہر ایک گوشہ کے متعلق وہ حکیمانہ ہدایات دی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ صحرائے عرب میں پیدا ہونے اور وہیں رہنے بسنے والی اس اُمی لقب ہستی نے قیامت تک پیدا ہونے والے ہر نئے سے نئے مسئلے کا ایسا حکیمانہ اور منصفانہ حل پیش فرمایا ہے کہ دنیا اُن کو اختیار کرتی تو جن شر و فساد، بے اطمینانی کے بھنور میں وہ آج پھنسی ہوئی ہے اس سے بہت دُور رہتی اور آج بھی اگر پُورے عالم اور انسانیت کا امن و امان اور اطمینان و سکون کہیں مل سکتا ہے تو وہ صرف آپؐ ہی کی تعلیمات میں ہے۔

بقول اقبال مرحوم

مزدکی ہو کہ فرنگی ہوس خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

مگر افسوس ہے کہ عام مسلمانوں نے بھی آپ کی زندگی آپ کی سیرت اور تعلیمات کو اس حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ تعلیماتِ نبوی کو صرف چند عقائد و عبادات ہی کی حد تک دیکھا ہے۔ اس پر نظر بہت کم لوگوں نے ڈالی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اُمت کے امام و امیر اور حاکم ہیں، اسی طرح آپ اُمت کے ایک ایک فرد کے شفیق باپ بھی ہیں اور جس طرح آپ مجسم رحم و کرم اور عفو و درگزر ہیں اسی طرح دشمنانِ خدا تعالیٰ کے مقابلے میں قہرِ الٰہی کا ایک مظہر اور بے نظیر جنگی کمانڈر بھی ہیں، جس طرح آپ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑنے اور اُس کا بندہ بنانے میں تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان ایک خاص فوقیت رکھتے ہیں اسی طرح آپؐ نے انسانوں کے باہمی معاملات اور معاشرت کو پاکیزہ اور صاف ستھرا بنانے کے لیے جو کام کیا ہے اس کی بھی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی۔

معاملات اور معاشرت کے وہ عادلانہ اور حکیمانہ اصول تلقین فرمائے کہ ان کو اپنایا جائے تو اُس حقوق طلبی کی جنگ کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا جس نے آج کل دنیا کو آگ و خون کا ایک جہنم بنایا ہوا ہے اور یہ کوئی صرف نظری اور فکری چیز نہیں خالص عملی اور واقعی ہے۔ جس وقت تک دنیا میں ان اصول پر کسی درجے میں بھی عمل رہا فرائض و حقوق کی جنگ کا کہیں نام نہ تھا۔ اس معاملے میں آپؐ کی تعلیم اور اُس کے ساتھ عملی تربیت کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض کو پہچانے اُن کو ادا کرے تو دوسروں کے حقوق خود بخود ادا ہو جائیں گے، کیونکہ اس دنیا میں ایک فرد کے فرائض ہی دوسرے کے حقوق ہوتے ہیں اور ایک کے حقوق ہی دوسرے کے فرائض ہوتے ہیں۔ اگر اولاد کے فرائض ماں باپ کے حقوق ہیں تو ماں باپ کے فرائض اولاد کے حقوق ہیں۔ حاکم کے فرائض رعایا کے حقوق اور رعایا کے فرائض حاکم کے حقوق ہیں۔ سرمایہ دار کے فرائض مزدور محنت کش کے حقوق ہیں اور مزدور کے فرائض سرمایہ دار کے حقوق ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں جب ہر شخص اپنے فرائض پر نظر رکھتا اور اُن کو پورا کرتا تھا تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہو جاتے تھے۔ اِسلام نے زور اس پر دیا کہ ہر شخص اپنا فرض ادا کرنے کی فکر کرے اور حق طلبی کے معاملے میں فیاضی اور ایثار سے کام لے۔ اگر کسی نے اس کے حق میں کوتاہی برتی ہے تو عفو و درگزر اور صبر سے کام لے۔ اپنے فرائض جو اس شخص سے متعلق ہیں اُن میں کمی نہ

آنے دے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تعلیمات پر کسی درجہ میں بھی جب تک عمل ہوتا رہا حق طلبی کی جنگ نہیں اُبھری۔ مزدور اور سرمایہ دار الگ الگ تو بن نہیں بنیں ان دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں اُٹھا۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات اُس نامعقول اور ناقابلِ عمل مساوات کی کبھی حامی نہ تھیں جس کے نعرے لگا کر آج مزدور کا خون گرمایا جاتا ہے اور پھر مزدور کے خاک وخون سے تعمیر ہونے والے محلات پر چند افراد حکمرانی کرتے ہیں۔ یہ بات طویل ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر نظر کی جائے تو آپؐ زندگی کے ہر شعبہ میں امت کے امام و پیشوا ہیں۔ ہر شعبہ کے متعلق آپ کی ہدایات ہیں۔ تذکار محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مضامین اس کی طرف رہنمائی کا پہلا قدم ہے۔

ضرورت اس کی اب بھی ہے کہ جن عنوانات پر "شام ہمدرد" کی مختلف تقریروں میں ایک وقتی بیان کی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے ان عنوانات پر ایک ٹھوس علمی اور تحقیقی کام کر کے سیرت طیبہ کو نئے عنوان سے ترتیب دیا جائے جو بڑی علمی کاوش اور تحقیق کو مقتضی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ایسے وقتی بیانات اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے مگر اُس کی طرف ایک خوش آیند قدم ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو مسلمانوں کے لیے نافع و مفید بنائے اور مستقبل میں کوئی فرد یا جماعت اس کو ایک تحقیقی تصنیف کی صورت دیدے۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اساتذہ اور طلبہ

جناب عبدالہاشم خاں صاحب
وائس چانسلر، جامعہ پشاور

یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ مجھے اس بابرکت اور مقدّس محفل کی صدارت کے فرائض انجام دینے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

یہ اعزاز بخش کر میری جو عزّت افزائی کی گئی ہے، میں اس کے لیے منتظمین محفل اور آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے آپ کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا کہ سرکار دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ اقدس میں لب کشائی کر دوں لیکن سرورِ کائنات ﷺ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کو اپنے لیے ایک سعادت سمجھتے ہوئے آپ کی خدمتِ اقدس میں پیش ہونے والے گلدستے میں اپنی عقیدت کے چند پھول سجانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کہ شاید اسی طفیل آپ سے، دور ہی کی سہی، نسبت حاصل ہو۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم تاریخِ انسانیت کی عظیم ترین شخصیّت سے نسبت رکھتے ہیں۔ فخرِ موجودات سرورِ کائنات، سرکارِ دو عالم جس بلند مقام پر فائز تھے، اُس کے بے شمار پہلو ہیں۔ ان میں سے جس پہلو پر بھی ہم نظر ڈالیں، وہ ہمیں کامل ملتا

ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی یا انگلی رکھنے کی جگہ نظر نہیں آتی۔ ان مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور اس محفل میں بھی آپ نے سُنا ہے۔ میں حضورؐ کے اخلاقِ فاضلہ کے متعلق چند معروضات پیش کر رہا ہوں۔

آپؐ اخلاق فاضلہ کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ آپؐ کے اقوال و افعال اور اخلاق و عادات رہتی دنیا تک عالمِ انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار رہیں گے۔ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود خالقِ کائنات نے آپؐ کو ان الفاظ میں مخاطب فرمایا: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ہ بے شک آپ عظیم اخلاق کے مالک ہیں۔

اخلاقِ فاضلہ ہی وہ عظیم الشان سرمایہ تھا کہ آپ کے بدترین مخالف، مشرکین، یہودی اور عیسائی آپ کے خون کے پیاسے ہونے کے باوجود آپ کی سیرت و کردار کے متعلق کہیں بھی انگشت نمائی نہ کر سکے۔

آپ کے اخلاقِ فاضلہ کا ہر ہر پہلو اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہے اور جاذبیت سے اس حد تک بھرپور ہے کہ اسے دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے:۔

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست"

اور اس کے عمیق مطالعے کے بعد یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر" تاہم آپ کی شان رحمۃ للعالمین کچھ ایسی ہے کہ اس کی جھلک آپؐ کی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے میں نظر آتی ہے۔

آپؐ کی بعثت کے وقت پوری دنیا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی۔ کوئی اعتقادی یا عملی خرابی ایسی نہ تھی جس سے اقوامِ عالم میں کسی کا دامن بھی بے داغ رہا ہو۔ خود وہ ممالک بھی جو ایک دور میں تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کے علم بردار رہے تھے، اُن گمراہیوں میں کسی سے کم نہ تھے۔ یونان، مصر، ہندستان، چین غرض یورپ، افریقہ اور ایشیا کے تمام ممالک ہر قسم کی خرابیوں کی آماجگاہ تھے۔ حد یہ ہے کہ وہ اقوام بھی، جن کے پاس آسمانی کتابیں موجود تھیں، دوسروں کی رہنمائی تو درکنار، خود بھی ہر لحاظ سے نہایت پست سطح کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس سلسلے میں اہلِ عرب، جو ایک مدّت سے وحی الٰہی کی تجلّیات سے محروم رہے تھے، اور بھی ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔

اِن حالات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے۔ آپ پوری نوعِ انسانی

کے لیے معلّم بنا کر مبعوث ہوئے۔ آپ کا مشن بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت تھا۔ آپ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اُس میں پڑھنے (اقراء) سیکھنے اور سکھانے (عَلّم) اور لکھنے (القلم) کا اشارہ ہے۔ اُس وقت کے عام تصوّرات کی رُو سے، علم حاصل کرنا ایک خاص خاندان یا طبقے کی میراث سمجھا جاتا تھا، اور اِس محدود یا مخصوص طبقے سے باہر کا کوئی فرد اس بات کا مجاز نہ تھا کہ علم حاصل کر سکے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت صاف الفاظ میں اس عظیم غلط فہمی سے پردہ اٹھایا اور اعلان فرمایا کہ:

"طلبِ علم ہر مسلمان مرد و زن کا فریضہ ہے۔" (ابنِ ماجہ)

اس کے ساتھ ہی آپؐ نے مختلف پیرایوں میں علم پھیلانے پر بھی زور دیا اور خود اشاعتِ علم کے لیے مختلف طریقے اختیار فرمائے، جن کا اثر یہ ہُوا کہ آپؐ ہی کے عہدِ مبارک میں تعلیم و تعلّم کا آغاز ہُوا۔

عہدِ نبوی میں تعلیم و تربیت کی ایک صورت تو یہ تھی کہ مختلف قبیلوں کے لوگ چند دنوں کے لیے مدینہ منوّرہ جاتے، وہاں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ضروری مسائل سیکھتے اور واپس جا کر اپنے اپنے قبیلے کے دوسرے افراد کو تعلیم دینے لگتے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ مسجدِ نبوی کے اندر ایک طرف ایک سائبان (صُفّہ) تعمیر کیا گیا تھا۔ وہاں بہت سے صحابۂ کرامؓ مستقل سکونت رکھتے تھے اور تعلیم و تعلّم یا ذکر و عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ یہ گویا عالمِ اسلام کی سب سے پہلی اور اُس وقت کے لحاظ سے سب سے بڑی "اسلامی یونیورسٹی" تھی اگرچہ اس سلسلۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ حلقۂ ذکر بھی ہوتا تھا مگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم حلقۂ تعلیم کے ساتھ زیادہ محبّت رکھتے تھے۔ چناں چہ ایک دن وہاں ایسے وقت تشریف لے گئے کہ جب دونوں حلقے تعلیم اور ذکر میں مشغول تھے۔ آپؐ نے دونوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، مگر فرمایا، "میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اور یہ کہہ کر اس حلقے میں تشریف فرما ہوئے جو تعلیم کا تھا۔ آپ اس یونیورسٹی کے فاضل صحابۂ کرام کو نو مسلم قبیلوں میں تعلیم و تدریس کے لیے روانہ فرمایا کرتے تھے۔

ایک مُعلّم کی سب سے پہلی اور بنیادی صفت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے متعلّمین یا شاگردوں کے لیے دل کی پوری گہرائیوں سے خلوص، ہمدردی اور شفقت کے جذبات

رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں آپ کی تعلیمات یہ تھیں:

(ا) جو چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ میری اُمّت سے نہیں (ترمذی)

(ب) تم لوگوں کو علم سکھاؤ اور ان پر سختی مت کرو۔ (جامع صغیر)

(ج) جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ (بخاری)

(د) رحم دل کی صفت ہے اس سے وہی شخص عاری ہے جو بدبخت اور بدنصیب ہے۔ (ابوداؤد)

(ہ) جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ (بخاری)

اِن تعلیمات میں جہاں بڑوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ رحم اور شفقت کا سلوک روا رکھیں، وہاں چھوٹوں کو بھی اُن کے فرائض سے آگاہ کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

(ا) جس نے بڑوں کی عزّت نہ کی، وہ ہماری اُمّت سے خارج ہے۔ (ترمذی)

(ب) جو نوجوان بھی کسی بزرگ کی عزّت کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس کی بزرگی کے وقت اس کی عزّت کرنے والے پیدا کرے گا۔ (ترمذی)

درحقیقت مسلم معاشرے میں اگر باہمی شفقت اور احترام کے جذبات پیدا ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں سکون پیدا ہو کر وہ ترقی سے ہم کنار نہ ہو۔ مسلم معاشرے کا جو وصف قرآن مجید نے بنایا ہے، وہ علاّمہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں، تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

"اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کا یہی وہ نقشہ تھا کہ باہمی لین دین میں تو آپس میں شیر و شکر ہو کر رہتے تھے لیکن باطل کے مقابلے میں ایک زبردست طوفان بن جاتے تھے۔

مُعلّم کی تعلیمات کا اثر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ خود اس کا عملی نمونہ بھی پیش کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقی معلّم کی حیثیت سے جو کچھ دوسروں کو بتایا پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ کے دل میں اپنی اُمّت کے لیے، جس کے لیے آپؐ مُعلّم بنا کر

مبعوث ہوئے تھے، بے انتہا شفقت اور خلوص کے جذبات موج زن رہتے تھے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"لوگو! تمھارے پاس تم میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمھاری تکلیف ان پر بہت گراں گزرتی ہے۔ اور تمھاری بھلائی کے بے حد خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔"

(۹ : ۱۲۸)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

"اے پیغمبر! خدائے تعالیٰ کی مہربانی سے، آپ ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپؐ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ آپ اُن کو معاف کر دیجیے۔ ان کے لیے خدا سے مغفرت طلب کیجیے اور اپنے معاملات میں اُن سے مشورہ کیجیے۔ (۳ : ۱۵۹)

ان دونوں آیتوں میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کرتے ہوئے پروردگارِ عالم نے ایک مُعَلّم اور ایک رہنما کے لیے راہِ عمل بتائی ہے۔ اُن کی شان یہی ہونی چاہیے کہ لوگ اُن میں کشش اور جاذبیت پائیں اور انھیں اپنا ہمدرد، مشیر اور رفیق سمجھیں۔ چناں چہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بعض اوقات دیہات سے آنے والے لوگ نہایت اُجڈ طریقے سے سوالات کرتے مگر آپ نہایت شفقت اور تحمّل سے جوابات دیتے تھے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہی مقناطیسیت، شفقت اور ہمدردی تھی جس نے اطراف واکناف سے لوگوں کو کھینچ کر آپ کے ارد گرد جمع کیا اور وہ جگہ جہاں بمشکل سترہ ایسے آدمی موجود تھے جو پڑھنے لکھنے سے معمولی واقف تھے، وہاں کا ہر فرد علم اور حکمت کا علم بردار بن گیا اور نہایت مختصر مدّت میں مسلمان نہ صرف علمی اور اخلاقی دنیا میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے بلکہ مادّی اور سیاسی لحاظ سے بھی اقوامِ عالم پر سبقت لے گئے۔

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جس طرح مُعَلّم کی خصوصیات سے لوگوں کو عملاً آگاہ فرمایا، وہاں اس کی بھی ضرورت محسوس کی کہ شاگرد کو اُس کے فرائض کی طرف توجّہ دلائی جائے۔ فرمایا:-

(ا) جن سے تم علم سیکھتے ہو اُن کی تعظیم کیا کرو۔ (ابوداؤد)

(ب) علم سیکھو اور سکون اور وقار سیکھو اور جس سے علم سیکھو اُس سے تواضع اور انکساری کا برتاؤ کرو۔ (جامع صغیر)

شاگرد کے ساتھ اُستاد کی شفقت اور شاگرد کے دل میں اُستاد کی عظمت یہ دو ایسے وصف ہیں کہ اُستاد اور شاگرد کا رشتہ ان خصوصیات کے بغیر استوار نہیں رہ سکتا اور یہی دونوں خصوصیتیں ہیں جن کی طرف دنیا کے اس عظیم مُعلّم نے رہنمائی کی۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بھی اس مقدّس پیشے سے وابستہ ہیں۔ حضورؐ کی تعلیمات اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آئیے اس اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنائیں اور اس کی روشنی میں آگے بڑھیں۔ اسی میں ہماری کامیابی، کامرانی اور سُرخ روئی کا راز مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس اُسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شامِ ہمدرد، پشاور
شنبہ۔ ۴ مئی ۱۹۷۰ء ش

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت دہندۂ
نظامِ معاشی و اقتصادی

جناب مولانا محمّد اشرف صاحب
صدر شعبۂ اسلامیات، اسلامیہ کالج، پشاور

جس ذاتِ گرامی کی معرفت و کلام و پیام کے لیے یہ تذکار منعقد کیا گیا ہے، اس کی جلالتِ شان و رفعتِ مقام پر مجھ جیسے بے بصیرت، تہی مایہ کا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تاہم ممنون ہوں کہ اس شرف سے نوازا گیا۔ یہ جناب حکیم حاجی حافظ محمد سعید صاحب کی سعادت و حکمت ہے کہ شامِ ہمدرد میں تذکارِ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے صبحِ تجلّی کا منظر پیدا کر دیا۔ یقیناً ایسی مجالس حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گراں مایہ اور آپؐ کے کلام و پیام کی اشاعت کے لیے مفید ہیں۔

ہمارے آقا سید الانبیا حبیبِ خدا حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ تبارک و تعالےٰ کے آخری رسول اور نبوّت کا معراجِ تام ہیں۔ آپ کی بعثت کا دائرہ ہر زمان و مکاں کو اپنے دائرۂ عمل اور حیطۂ اختیار و نفوذ میں لیے ہوئے ہے۔ آپ جملہ انبیاء کے سردار، اپنی تکمیل و جامعیت میں ممتاز، گلشنِ نبوّت کے گلِ سرسبد اور باعث و حاصل آفرینشِ کائنات ہیں ؎

آب و گِل میں مدتوں آرائشیں ہوتی رہیں — تب کہیں اک آدمی کونین کا حاصل بنا

آپ سے پیشتر جو نبی یا رسول آئے، وہ کسی خاص قوم، طبقے یا محدود وقت کے لیے تشریف لائے، لیکن آپ ہمیشہ کے لیے آئے۔ ہر طبقہ و گروہ، ہر نسل و قوم اور ہر ملک اور علاقے کے لیے آئے آپ کی نبوت لازوال، آپ کی رسالت دائمی، آپ کا دین ابدی ہے۔ اس لیے آپ کی شان سب انبیا میں نمایاں، کام سب سے اونچا، کردار سب سے پیارا، دائرہ سب سے وسیع و مکمل، نمونہ سب سے اعلا اور پیام ہمہ گیر و عالم گیر ہے۔ اس لیے آپ کا ہر نظریہ و عمل، ہر قول و فعل، اپنی جامعیت و کاملیت میں اپنی نظیر آپ اور دل کشی و محبوبیت میں لاثانی و بے مثال ہے ؎

تو ہے مجموعۂ خوبی و سراپائے جمال
کون سی تیری ادا دل کی طلب گار نہیں

آپ کا دین توحیدِ الٰہی کے ساتھ وحدتِ انسانیت، دین و دنیا کی یک جائی، معاش و معاد کے ارتباط اور دنیا و آخرت کے باہمی ربط و تسلسل کا علم بردار ہے۔ آپ کا دین، مسجد و بازار اور خدا پرستی اور دنیا داری کی دوئی کا قائل نہیں۔ بلکہ آپ کے دینِ وحدت نے انسانی زندگی کو ایک 'کُل' کی صورت میں پیش کیا۔ جس میں انسان کے جملہ انفرادی و اجتماعی، دینی و دنیاوی، قومی و طبقاتی، نجی و عائلی، تجارتی و زراعتی، صنعتی و معاشی، اقتصادی و سیاسی، معاشرتی و عمرانی احوال و معاملات کا انتہائی منصفانہ و قابلِ عمل حل پیش کر دیا گیا۔ جس میں جملہ طبقاتِ انسانی کے مفادات و ضروریات کی رعایت کی گئی ہے۔

اپنے موضوع پر بات شروع کرنے سے پیشتر ایک ضروری نکتے کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہوتے ہیں اس لیے جب ہم ان کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بات کہنا چاہیں تو ہمیشہ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ رسول کا پیام اس کا ذاتی نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے سن کر کہتا اور اللہ تعالیٰ سے دیکھ کر سناتا ہے۔ اس لیے ہر نبی کے قول و فعل پر الٰہی علم کی مُہر لگی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے قول و فعل میں علوم و مرضیاتِ الٰہیہ کا پیامِ رساں اور نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا مخلوق سے تعلق اپنی انسانی نسبت سے کم اور اپنی نبوی اور الٰہی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔ چناں چہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولٰکن رسول اللّٰہ وخاتم النّبیین وکان اللّٰہ بکلّ شیٔ علیماً ۔ (۳۳ : ۴۰)

(محمّد صلی اللّٰہ علیہ وسلّم تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللّٰہ تعالیٰ کے پیام بر اور اللّٰہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔)

اس آیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اے انسانو! حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سے تمھارا انسانی ونسبی تعلّق نہیں۔ اس لیے ان کے کلام وپیام کو ان کی بشری حیثیت سے نہ پرکھو۔ بلکہ ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ان کے ہر پیام وکلام اور ان کے عطا کردہ ہر نظام کو خواہ وہ عبادات سے متعلّق ہو یا معاملات سے، معاشرت سے متعلّق ہو یا معاشیات سے، اقتصاد سے متعلق ہو یا سیاسیات سے، تدبیروں سے متعلّق ہو یا عائلی قوانین سے، زندگی کے جس طبقے یا جس مسئلے کے متعلّق انھوں نے جو حل اور طریقہ بتا دیا، ان کا ذاتی تجویز کردہ نہیں۔ بلکہ رسول اللّٰہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اللّٰہ تعالےٰ کے علم وپیام، حکم ومنشا کو آپ تک پہنچایا ہے۔ اس لیے ان کی بات گویا اللّٰہ تعالےٰ کی بات اور ان کی اطاعت گویا اللّٰہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ قرآن کریم ہمارے اس دعوے کی تصدیق ان آیاتِ پاک میں کرتا ہے:

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ (۵۳: ۳، ۴)

من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ ۔ (۴: ۸۰)

اس آیت سے دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے۔ کہ حضرت محمّد رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نسبی اور زمانی اور مکانی لحاظ سے اللّٰہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔
آپ پر نبوّت اور رسالت کے ہر جزو کل کو ختم کر دیا گیا اس لیے اب آپ کا پیام اور لایا ہوا نظامِ زندگی اور حیاتِ انسانی کے متعلق بتاتے ہوئے جملہ طریقے پوری انسانیت کے لیے قیامت تک اللّٰہ تعالےٰ کا آخری پیغام اور انسانی فوز وفلاح اور کامیابی ونجات کا آخری نظام ہے، جس میں کسی تبدیلی وتغیّر کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس پیغام ونظامِ حیات کی بھیجنے والی اللّٰہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو کان اللّٰہ بکلّ شیٍٔ علیما۔ کا مصداق ہے یعنی وہ ازل سے ابد تک کے احوال وکوائف کا جاننے والا جملہ

طبقاتِ انسانیہ کے مفادات کا نگہبان و نگران اور ہر زمانے میں پیش آنے والے انسانی مسائل سے واقف ہے۔ پس جو نظامِ حیات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا وہ جملہ انسانوں اور ہر طبقے کے مفادات وضروریات کا کفیل اور بہترین حل ہے۔ کہ اس کا اصل مُوجِد و شارع یعنی پیش کرنے والا اللہ تبارک وتعالےٰ ہے۔ اس لیے یہی نظام منصفانہ اور عادلانہ ہو سکتا ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسا نظامِ حیات نہیں دے سکتی خواہ معاشی و اقتصادی ہو خواہ سیاسی و قانونی، جس میں ہر طبقے اور ہر گروہ کے حقوق کی برابر منصفانہ نگہداشت اور رعایت کی گئی ہو۔ اس لیے غیر اللہ کے کسی طبقے یا گروہ یا فرد کا مجوزہ نظام یا اس کا کوئی جزو، اسلامی نظام کی جگہ لے سکتا ہے نہ اس کا پیوند لگایا جا سکتا ہے۔ انسانوں کا جو گروہ یا طبقہ یا فرد قانون بنائے گا، اس میں انسانی بشری میلانات اور تقاضوں کی بنا پر طبقاتی و نسلی، وطنی و لونی اور ملکی مفاداتِ خاصّہ کی کچھ نہ کچھ رعایت ہوتی جاتی ہے۔ جیسا کہ دُنیا کے دساتیر و قوانین اور ان کی تاریخ سے واقف حضرات اچھی طرح جانتے ہیں۔ سرمایہ دار، مزدور کی رعایت کما حقہٗ نہیں کر پاتا۔ مزدور سرمایہ دار کے مفادات سے کامل انصاف فطرتاً نہیں کر سکتا۔ جمہوریت میں اقلیت کی رائے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ ڈکٹیٹر شپ میں فردِ واحد کی چلتی ہے۔ غرض صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے جس کے لیے پوری مخلوق بدرجۂ عیال کے ہے حدیثِ پاک میں آتا ہے: الناّس عیال اللہ، (بیہقی)

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے سے جو قانون بھیجا ہے اور جو نظامِ عدل یا نظامِ اقتصادیات و معاشیات دیا ہے، وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے تمام احوال و وقائع کو جان کر دیا ہے۔ جس میں کسی طبقے کی رعایت نہیں۔ نہ کسی کا خوف عدل میں مانع رہا ہے۔ اس لیے وہ نظام ہر ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی دادرسی کے لیے دیا گیا ہے۔ بقول مولانا رومیؒ ۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

اس میں کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ نہ ظلم کی کسی کو اجازت دی جائے گی۔ حدیثِ قدسی میں حضورِ انور

صلی اللہ علیہ وسلم نقل فرماتے ہیں :

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ بینکم محرما فلا تظالموا (صحیح مسلم)

(اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اس کو تمھارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو)۔

حضرت اقبالؒ نے بھی قانونِ الٰہی اور قانونِ غیر کے متعلق خوب کہا ہے ؎

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ | در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
عادل اندر صلح و اندر مصاف | وصل و فصلش لایراعی لایخاف
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر | سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود | زور ور بر ناتواں قاہر شود

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چوں دوک

غرض قانونِ الٰہی میں کسی خاص طبقے، گروہ، جماعت یا فرد کے لیے کسی ظالمانہ مراعات و تحفظات کا کوئی چور دروازہ کھلا نہیں رکھا گیا بلکہ ہر طبقے کے لیے انسان کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر ایسا عادلانہ و منصفانہ نظامِ اقتصاد و معاشیات پیش کیا گیا ہے، جس میں ہر طبقۂ انسان کے حقوق کی حفاظت، اس کی دارین کی ترقی کا انتظام اور مختلف طبقاتِ انسانیہ میں انس و محبت اور یگانگت و اخوت کا پورا پاس رکھا گیا ہے۔

ان بنیادی حقائق کو پیش کرنے کے بعد ہم اسلام کے نظریۂ اقتصاد کے چند اساسی نکات بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد انشاءاللہ اس محدود وقت میں اس کا مختصر عملی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظامِ اقتصاد پیش کیا، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا ہے اور جس طرح ہر نظام کا ایک مابعد الطبیعیاتی یا فکری پس منظر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اس نظام کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں، اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ نظامِ اقتصاد و معاش

کی بھی چند مابعد الطبیعاتی اور فکری بنیادیں ہیں۔

پہلی بنیاد اللہ تبارک و تعالیٰ کی ربوبیتِ کبریٰ اور رزّاقیتِ مطلقہ کا تصوّر ہے کہ اصلاً پوری انسانیت کی پرورش و ضروریات کی کفالت اللہ تعالیٰ کے ذمّے ہے۔ قرآنِ کریم کی بے شمار آیات و احادیث مبارکہ کا ذخیرہ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ ربوبیتِ الٰہیہ کا یہ نظام گو کائنات کے ذرّے ذرّے میں جاری و ساری ہے لیکن محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق چوں کہ انسان نِرا حیوان یا بڑھیا حیوان نہیں بلکہ خلیفۂ الٰہی اور انسانی شرف و فضیلت کا حامل ہے، اور اس کی زندگی اور ضروریات صرف اس عالم ہی میں ختم نہیں ہو جائیں گی، اس لیے اللہ تبارک و تعالےٰ نے انسان کے بارے میں چند موٹی موٹی باتوں پر اپنی ربوبیت کے نظام کی بنا رکھی۔

۱۔ اس کی دنیاوی و معاشی بنیادی ضرورتیں کسی صورت نظر انداز نہ کی جائیں اور اس میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں۔ چناں چہ قرآنِ کریم نے حضرت آدمؑ کی پیدائش کے وقت ہی ان ضرورتوں کی کم از کم تحدید فرما کر اعلان فرمادیا :

اِنَّ لکَ الا تجوع فیھا ولا تعریٰ وانکَ لاتظمؤ فیھا ولاتضحیٰ ۔ (۲۰ : ۱۱۸، ۱۱۹)

(بلاشبہ تمھارا یہ حق ہے کہ تم یہاں نہ بھوکے رہو اور نہ ننگے رہو اور یہ کہ تم نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کی تپش اٹھاؤ)

یعنی انسان کے کم از کم بنیادی حقوق چار ہیں۔ روٹی، کپڑا، پانی اور مکان۔

۲۔ چوں کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء علیہم السلام کے نزدیک انسان کی ضروریات صرف اس عالم ہی میں منحصر نہیں، بلکہ یہ عالم ایک رہگزر ہے جہاں سے چل کر انسان کو اپنے اصلی ٹھکانے آخرت میں پہنچنا ہے۔ جہاں اس کا ہمیشہ ہمیشہ کا قیام ہوگا۔ اس لیے اس کی پرورش کا نظام اور اس کی دنیاوی جملہ حاجتوں کی کفالت کا حکیمانہ طریقہ یہ مقرر کیا گیا کہ یہاں کی ضروریات بھی بطرزِ احسن پوری ہوں، اور آخرت کی زندگی بھی اس کے ساتھ ساتھ بنتی چلی جائے۔ چناں چہ قرآن کریم نے ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا ویعلم مستقرھا ومستودعھا۔ (۱۱ : ۶)

(اور نہیں کوئی چلنے والا زمین پر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمے اس کا رزق ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے رہنے کی جگہ اور زیادہ رہنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔)

چناں چہ حدیث پاک میں دُنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا ہے کیوں کہ انسان کے ہر عمل کا پھل اُسے آخرت میں ملے گا۔ اس لیے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو طریقۂ حیات دیا، وہ بیک وقت دین و دُنیا، دونوں کی بھلائی اور کفالت کا ضامن ہے۔

۳۔ انسان چوں کہ خلیفۂ الٰہی ہے اس لیے اس کی خلافت کے جوہر و خصائص اور کمالات کی بقا کو اس نظامِ معاش و اقتصاد میں اس کے حیوانی تقاضوں سے بڑھ کر اہمیّت دی گئی ہے۔ خلافت کے جوہر سے ہماری مراد انسان کی وہ اعلیٰ اقدار ہیں، جو اخلاقِ فاضلہ یعنی رحم و کرم، جود و سخا، صبر و شکر، قربانی و ایثار، اخلاص و بے نفسی، غم گساری و چارہ سازی، محبّت و اُلفت وغیرہ جیسے اوصافِ حمیدہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ ان جوہر کی بقا اور آخرت کی زندگی کے بناؤ کے لیے مختلف و متفاوت صلاحیتوں کے انسانوں کے لیے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسے منصفانہ اور عادلانہ نظامِ معیشت و اقتصاد پیش کیا، جس میں ہر فرد اور طبقہ اپنی جملہ صلاحیّتوں کو بطریقۂ احسن بروئے کار لا سکے۔ اس کی دُنیاوی اور معاشی حاجتیں بھی کماحقہٗ پوری ہو جائیں اور اس کے اخلاقِ فاضلہ کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے۔ بلکہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کا انسان اسی نظامِ معاش و اقتصاد، محنت و چین، سکون و اطمینان اور بھائی چارے کی زندگی گزار سکے، جس میں طبقاتی کشمکش، گروہی کشاکش اور باہمی جنگ و جدل، رقابت و منافست کے جذبات کارفرما نہ ہوں، بلکہ ہر طبقۂ انسانی دوسرے طبقے کا ہمدرد و غم گسار، معاون و مددگار، خیرخواہ اور خدمت گار بن کر زندگی گزارنے کو اپنی نجات و کامیابی کا ذریعہ سمجھے۔ حضرت رسول انور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: کونوا عباد اللّٰہ اخوانا۔ یعنی اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن کر زندگی گزارو کیوں کہ تمھارے ایمان کا نشان یہ بھی ہے کہ جو بھلائی اپنے

لیے چاہتے ہو دوسرے انسانوں کے لیے بھی چاہو اس لیے حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو نظام معاش و اقتصاد دیا، اس میں مزدور کے مفاد کی نگہداشت کو سرمایہ دار کا دین بنا دیا گیا کاشت کار کے حقوق کی ادائیگی کو زمیندار کا مذہب قرار دیا گیا اور مال دار کی جائز حاجتوں کو پورا کرنا مزدور کے لیے عبادت ٹھہرایا گیا اور زمیندار کے حقوق کی ادائیگی کاشت کار کے لیے نیکی بنا دی گئی۔ حاکم و محکوم، کاشت کار و زمیں دار، مزدور و مال دار غرض یہ کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے مفادات کو آپس میں ٹکرایا نہیں، بلکہ انسانیت کی بنیاد پر جملہ طبقات کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے انھیں آپس میں ایک جسدِ واحد کی طرح جوڑ دیا گیا کہ رب العالمین کے فرستادہ رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں منافرت حقارت، جنگ وجدل کے جذبات کو سازشوں یا انقلابی دعوتوں کے ذریعے بھڑکانے نہیں آئے تھے بلکہ آپ کا پیام باہمی اُلفت و محبت، بھائی چارے اور یگانگت انسانی ہمدردی و غم گساری کا تھا۔ بقول عارف رومی انبیا علیہم السلام توڑنے نہیں آتے جوڑنے آتے ہیں۔ وہ مختلف طبقات کو آپس میں لڑاتے نہیں آپس میں جوڑتے ہیں ؎

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

قرآن پاک نے حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس اخوّت انسانیہ کے انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا ۔ (۳: ۱۰۳)

حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس عادلانہ اور منصفانہ نظامِ معاشیات و اقتصاد پیش کرنے سے پیشتر دنیا میں رائج دو بڑے نظاموں یعنی سرمایہ داری و اشتراکیت کے متعلّق بھی مختصر سی گفت گو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کر دینی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ تاکہ اس افراط و تفریط، غلط عمل اور اس کے باطل ردِّ عمل کے درمیان اسلام کے معتدل نظام کی حقیقت اُجاگر ہو سکے۔

۱ ۔ دنیا میں عموماً معاشی بُحران یا اقتصادی فساد دو وجوہ سے پھیلتا ہے۔ پہلی وجہ

سرمایہ داری کا وہ ظالمانہ و بہیمانہ نظام ہے، جسے قرآن پاک نے قارونیت و اکتنازیت (ارتکازِ دولت) کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کی بنیاد شخصی یا طبقاتی فوائد "VESTED INTEREST" خود غرضی اور ذاتی منافع پر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار دولت و زمین کو اپنی پیدا کردہ ذاتی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور اس کے تصرّف و نمو کا اپنے کو مختارِ مطلق گردانتا ہے، جس میں وہ کسی خدائی ضابطے یا حقیقی اخلاقی اقدار کا پابند نہیں ہوتا۔ اور نہ ملّت و انسانیت اور دیگر طبقاتِ انسانی کے مفادات کو اپنا ذاتی مفاد اور ان کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھتا ہے۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کے اس ذہن کا اشارہ قارون اور قوم شعیبؑ کے الفاظ میں بالترتیب اس طرح فرمایا ہے۔ قاروں کہتا ہے:

قال انما اوتیته علیٰ علم عندی (۲۸: ۷۸)

قارون نے کہا کہ یہ سب مال و دولت مجھے اپنی ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے اس لیے میں اس کا مالک حقیقی ہوں اور مجھے اس پر ہر طرح کے تصرّف کا حق حاصل ہے۔

قوم شعیبؑ نے کہا:

اصلوتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء (۱۱: ۸۷)

(کیا تمھاری نماز تمھیں اس بات کا حکم دیتی ہے۔ کہ ہم باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرّف کرنا ترک کر دیں)۔

گویا سرمایہ دار مال و دولت کو صرف اپنی مِلک سمجھتا ہے۔ اور اس میں ہر جائز و ناجائز تصرّف کو اپنے ذاتی مصالح و مفادات کے تحت سمجھتا ہے۔ خواہ اس کے اس عمل سے دوسرے طبقات کے حقوق کلیتاً یا جزواً سلب ہو جاتے ہوں۔ قرآن کریم نے سرمایہ داری کی اس ذہنیت کا تذکرہ حضرت داؤد علیہ السّلام کے سامنے ایک پیش شدہ مقدمہ کے تذکرے میں تمثیل کے طور پر کیا ہے۔ کہ ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوُا۔ اس میں دو فریق تھے۔ ایک کے پاس ننانوے دُنبیاں تھیں۔ دوسرے کے پاس ایک۔ ایک دُنبی والے

نے مرافعہ کیا کہ ننانوے دُنبی والا کہتا ہے۔ کہ یہ ایک دُنبی بھی مجھے دے دے کہ میری پوری سو ہو جائیں۔ ہمارے نزدیک سرمایہ دار کی حرص و آز کا یہی عالم ہے۔ وہ ہر جائز و ناجائز ذریعے سے دولت کے جملہ منابع اور ذرائع پر قبضہ کر لیتا ہے اور اس طرح چند دن میں دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ وہ پاکستان کے بائیس خاندان ہوں یا امریکا کے دو سو بیس خاندان، بات ایک ہی ہے۔

سرمایہ داری کی بنیاد جن بڑے بڑے ستونوں پر ہے، وہ بے لگام آزاد و باطل نجی ملکیت کے علاوہ سُود، قمار، EVERY GAME OF CHANCE (سٹہ وغیرہ) احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی اور دیگر ناجائز آمدنیاں وغیرہ ہیں اس نظام پر تفصیلی نقد و تبصرہ کا وقت نہیں، ورنہ بتایا جاتا کہ یہ ظالمانہ نظام کس طرح انسانیت کے جملہ اخلاقی و عادلانہ تقاضوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے ضمن میں زمین داروں کا غیر اسلامی نظام ہے جو کسی خدائی ضابطے اور حدود و قیود کا پابند نہیں ہوتا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت کی ناجائز و غلط لوٹ کھسوٹ کے ردِ عمل میں وہ منفی نظام جسے اشتراکیت و اشتمالیت اور انقلابی سوشلزم وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ہر اس دَور میں وجود میں آتا رہا، جب بھی سرمایہ دار کی بدعملی نے نادار طبقات کی زندگی اجیرن کر دی۔ چناں چہ مصر قدیم میں خصوصاً فراعنہ کے عہد میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ افلاطون نے نظریاتی طور پر اسے کسی حد تک پیش کیا۔ مشہور یونانی مقنن سولن کے عہد میں سپارٹا میں میگارگا نے اصولِ اشتراکیت کے مطابق دولت کو مساوی تقسیم کر دیا۔ ایران قدیم میں مزدک نے زن، زر، زمین کے عام ہونے کا نعرہ لگایا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے یورپ کے حالات نے اس ذہن کو جِلا بخشی، جس کا سب سے بڑا نمایندہ کارل مارکس ہے جس نے انجلز کے ساتھ مل کر اشتمالیت و اشتراکیت کو ایک مستقل مذہب بنا دیا اور بیسویں صدی میں لینن نے اسے عملی صورت بخشی اب روس اور مشرقی یورپ کے علاوہ چین میں ماؤزے تُنگ کی سرکردگی میں وہ ایک مستقل نظامِ حیات کی حیثیت سے رائج ہو نیا در دیگر ممالک میں پر دہال نکالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ اشتراکیت غلط سرمایہ داری کے ردِ عمل سے وجود میں آتا ہے۔ اس لیے اس کا مزاج ہر اس بات کا انکار کرتا ہے، جو سرمایہ دارانہ نظامِ معاش

ہیں ساری وطاری ہیں۔ "ردِ عمل" کے غیظ و غضب میں وہ سرمایہ دارانہ نظام کے غلط مالی خاکوں کو ہی نہ صرف ہٹاتا ہے بلکہ جو چیزیں وہاں رائج تھیں، اس کا قلع قمع بھی کر دیتا ہے۔ یورپ کے زمانۂ وسطےٰ کے حالات جن کے ردِ عمل نے مارکسزم کو جنم دیا، اس نظام میں اس طرح سمو گئے کہ اس نے نہ صرف مروّجہ اقتصادی نظام کو ختم کیا بلکہ بقول علامہ اقبالؒ ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نِگاہ لا کلیسا لا سلاطین و لا اِلٰہ

وہ منفی نعرہ بلند کر دیا جو اشتراکی نظام کی رگ و پے میں سرایت کر گیا اور اشتراکیت کی بنیاد میں انکارِ خدا، آخرت اور انکار اقدارِ روحانیہ اور اثبات پیٹ اور مادیت سمو گئی ہے ؎

دین آں پیغمبرے ناحق شناس بر مساواتِ شکم دارد اساس

گویا اب اشتراکیت ایک ایسا ملحدانہ نظامِ زندگی قرار پایا۔ جس میں خدا کی جگہ کارل مارکس نے، صحیفۂ آسمانی کی جگہ کیپیٹل نے اور پیغمبر کی جگہ لینن یا ماؤزے تنگ نے لے لی۔ اس کے اقتصادی نظام کی بنیاد میں ہیگل کے جدلیاتی نظریے اور ڈارون کے ارتقائی نظریے کی بنیادوں پر استوار ہونے کے بعد طبقاتی باہمی کشاکش اور مزدور و کسان اور سرمایہ دار اور زمین دار کی باہمی آویزش قرار پائی۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں اصل مسئلہ پیٹ اور صرف پیٹ کا ہے۔ اس بڑھیا حیوان کی حیوانی زندگی کی ضروریات کے جو مصادر و منابع تھے، باہمی کشمکش میں سرمایہ داروں نے قوت اور حیلوں سے ان پر قبضہ کر کے ایک بڑے طبقے کو آسائشِ زندگی سے محروم کر دیا۔ اور سرمایہ دار کے دھوکے اور دجل نے غریب اور مزدور کو فریب دینے کے لیے مذہب کی افیون ایجاد کی۔ اور خدا، پیغمبر، آخرت وغیرہ کے نظریات اور دین کی حدود و قیود میں اسے الجھا کر پیٹ کے اصل مسئلے سے بیگانہ کر دیا۔ اس لیے اشتراکی نظریے میں جیسے سرمایہ دار کا وجود گوارا نہیں ہے، اسی طرح نظریاتی اور عملی طور پر اشتراکی سوسائٹی میں "خدا، پیغمبر اور دین کا وجود بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں ایک ہی نظریہ جاری ہوگا اور ایک ہی کی بات چلے گی وہ مارکس ازم کی بات ہو یا چیئرمین ماوزے تنگ کی، جیسے ایک مملکت میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے، اشتراکی مملکت میں "اشتراکی مذہب" کے سوا دوسرا دین عملاً نہیں سما سکتا۔ جو اس کا انکار کرتا ہے، وہ حقائق کو جھٹلاتا ہے خصوصاً اسلام جیسا مذہب، جو زندگی کے جز و کل پر حاوی ہے، اشتراکی نظریات کی بقا کے ساتھ اس کا وجود قطعاً باقی نہیں

رہ سکتا۔

اشتراکیت چوں کہ نادار "HAVENOTS" اور مالدار "HAVES" کی آویزش کی نقیب ہے، اس لیے انسانی آبادی کا وہ کثیر حصّہ جسے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام نے قلاش بنادیا ہے، یعنی مزدور و کسان ـــــــ اس کے مسائل کے حل کرنے کی دعوت لے کر وہ آگے بڑھتی ہے۔ گویا وہ ایک طبقے کے مسائل حل کرنے کی داعی ہے اور پوری انسانیت کے مسائل کے حل کا وہ خود بھی دعوے نہیں کرتی۔ اشتراکیت ذرائع آمدنی اور مصادر ومنابع پیداوار کی عام ملکیت کی قائل ہے۔ اس لیے نجی ملکیت کا وہ قطعاً انکار کرتی ہے لیکن عملاً اشتراکی ممالک میں مصادر و منابع پیداوار، مملکت کی ملکیت قرار پاتے ہیں اور مملکت "کمیونسٹ پارٹی" جو کہ ایک مخروطی پارٹی ہوتی ہے، جس پر صرف چند چوٹی کے لیڈروں کا کُلّی اختیار رہتا ہے اس لیے سب دولت اور سرمائے کے سپید و سیاہ کے مالک وحاکم اور مختارِ کل کمیونسٹ پارٹی بالفاظِ دیگر اس کے چند سرکردہ لیڈر قرار پاتے ہیں، جن کے خلاف کسی آواز کا اٹھانا بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح اشتراکیت میں دولت اور زمین غریب وکسان اور مزدور کو نہیں ملتی بلکہ STATE OWNERSHIP میں چلی جاتی ہے اور اس کے منافع بھی برابر تقسیم نہیں ہوتے بلکہ جیسے کہ روس اور دیگر ممالک کی تنخواہوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تنخواہ اسّی ۸۰ روبل پچاس ۵۰ روپے سے تیس ۳۰ ہزار روبل چھے ہزار تک چلی گئی ہیں۔ (COMRADE YURN بحوالہ اکنامکس آف اسلام ص ۶۵)

بہرحال اشتراکی تحریک، مزدور اور کسان اور نوجوان طالب علم کو سبز باغ دکھا کر ایسے نظام میں قید کر دیتی ہے، جس سے بدتر آمرانہ نظام تاریخ نے نہیں دیکھا۔ جہاں انسانی بنیادی آزادیوں کا حال یہ ہوتا ہے ؎

نہ شکایت کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیّاد کی ہے

علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

اسلام نے ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ردِّ عمل یعنی غیر فطری و باطل اشتراکی

نظام کے مقابلے میں جو نظامِ اقتصاد و معاشیات دیا، وہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق جملہ طبقاتِ انسانی کی ضرورتوں کا کفیل اور انسان کی مادی اور دنیاوی حاجات کی کار برآری کے ساتھ اس کی روحانیت و آخرت کی کامیابی کا بھی کفیل ہے۔

معاشیات میں سب سے اہم مسئلہ زمین اور مال کی ملکیت کا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بے لگام آزاد نجی ملکیت کا قائل ہے۔ اشتراکیت قطعاً نجی ملکیت کی منکر ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظامِ اقتصاد و معیشت کی بنیاد چونکہ اللہ تعالےٰ کے تصورِ مالکیت و حاکمیت وغیرہ پر ہے، اس لیے اسلام میں اصلاً کوئی انسان کسی چیز کا حقیقی مالک اور متصرف نہیں ہوسکتا۔ کائنات اور اس کی جملہ اشیاء زمین اور اس کی جملہ پیداوار کا مالک و متصرف و مختارِ حقیقی صرف اللہ تعالےٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بیشتر آیات کا منشا ہے۔

للہ ما فی السمٰوات وما فی الارض، (۲: ۲۸۴)

للہ خزائن السمٰوات والارض۔ (۶۳: ۷) وغیرہ وغیرہ

کہیں اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر مجازی طور پر اپنے احکام اور نازل کردہ حدود و قیود کی پابندی کے ساتھ مختلف طبقاتِ انسانیہ کو ان کے مفادات کی رعایت کرتے ہوئے اور ان کی صلاحیتوں کو روبکار لانے کے لیے جتنا مناسب سمجھے" زمین و دولت کا نجی مالک بنا دے۔ یہ نجی ملکیت آزاد اور انسانی چاہتوں کی پابند نہیں ہوگی بلکہ الٰہی نجی ملکیت کا نظام آمدنی و صرف ہر حیثیت سے احکامِ الٰہی کا پابند اور حدودِ الٰہیہ سے مقید ہوگا۔ اور اس نجی ملکیت و دولت کا حصول و استعمال ایک امین کی حیثیت سے انسان کرے گا۔ گویا اسلام" مقید و پابندِ حدودِ الٰہی نجی ملکیت DIVINE CONTROLLED PRIVATE PROPERTY کی اجازت دیتا ہے جس کی ایک ایک پائی کی آمدنی و صرف کا حساب اسے اللہ تعالیٰ کو دینا ہوگا اور اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق آمد و خرچ نہیں کرے گا تو وہ ایسا مجرم ہوگا، جس کی عبادات تک بعض اوقات مقبول نہیں ہوں گی جس طرح کہ حرام کمائی والے کی نماز، حج اور زکوٰۃ بھی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق مقبول نہیں ہیں۔ غرض حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نظریہ ملکیت کے بارے میں یہ ہے ؎

در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست

ایں امانت چند روزہ نزد ماست

یہ مال و دولت اور نجی ملکیت اصلاً فضیلت و شرف کا سبب نہیں۔ بلکہ حکمتِ الٰہیہ نے اسے دے کر انسان کے اخلاقی جواہر و کمالات کو پرکھنا چاہا ہے کہ کیا انسان خلیفۂ الٰہی اور انسان کی حیثیت سے اس کا استعمال کرتا ہے۔ یا حیوانوں اور درندوں کی طرح اخلاق کے تقاضوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے کیوں کہ اسلام کے نزدیک اصل کمال انسان کا مال و دولت نہیں بلکہ اس کا ایمان و عمل ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقیّد و پابند حدودِ الٰہی نجی ملکیت کے نظام کو اس طرح قائم فرمایا کہ اسلامی نجی ملکیت کی اجازت ظالمانہ قارونی سرمایہ دارانہ نظام کو جنم نہ دے بلکہ دولت کی ایسی عادلانہ تقسیم ہو کہ ایک ہموار معاشی زندگی وجود میں آسکے، جس میں ہر طبقۂ انسانی راحت و چین کی زندگی گزار سکے، اور نہ صرف اس کی حاجات ضروریہ ہی پوری ہوں بلکہ وہ معاشرے میں ایک باوقار اور خود کفیل و فارغ البال انسان پرور خدا پرست انسان کی زندگی گزار سکے۔ مُقیّد نجی ملکیت کو ہموار رکھنے اور ارتکازِ دولت سے روکنے کو اسلامی اقتصاد کی ایک بنیاد قرار دیا گیا۔ قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر: ۷)

(تاکہ دولت تمہارے تونگروں ہی میں سمٹ کر نہ آجائے۔)

لیکن اسلام جہاں ارتکازِ دولت کو روکتا ہے۔ وہاں انسان کے اخلاق و روحانیت، خلافتی کمالات کی بقا کے لیے مساویانہ تقسیمِ دولت کا قائل نہیں۔ کیوں کہ اگر دولت سب میں برابر تقسیم ہو جائے تو جود و سخا، صبر و شکر، ایثار و قربانی، بھائی چارہ و غم گساری وغیرہ کی انسانی صفات بھی ختم ہو جاتی ہیں اور انسان نرا ایک حیوان یا ایک خود کار مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ انسانی قویٰ و صلاحیتوں کے تفاوت کی بنا پر بھی یہ "مساوات" عادلانہ نہیں۔ کیا آپ کی عقلِ سلیم یہ گوارا کرتی ہے کہ ایک مجھ جیسا جاہل گنوار اور ایک یونیورسٹی کا اعلا تعلیم یافتہ ماہر و حاذق اُستاد مالی لحاظ سے ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دیے جائیں۔ اس لیے "اسلامی مساوات" کا نعرہ غلط ہے۔ اسلام کے نظامِ معاشیات میں مساوات نہیں مواسات یعنی ہمدردی و غم گساری ہے۔ کہ ہر انسان کے درد کو اپنا

سمجھو۔ اور اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ کر پورا کرو۔ قرآنِ کریم نے اس عدمِ مساوات کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعضٍ درجٰت لیتخذ بعضھم بعضًا سُخریا۔
(زخرف - ۳۲)

ہم نے دنیاوی زندگی میں اُن کی روزی کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے۔ تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

واللہ فضل بعضکم علٰی بعض فی الرزق (نحل: ۷۱)

اور اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق میں فضیلت دی ہے۔

اسی طرح نجی ملکیت کا انکار قرآن کریم کی تقریباً ایک چوتھائی آیات کا ابطال اور اسلام کے پورے نظامِ معاشی کا انکار ہے۔ یہ بات بھی قطعاً غلط ہے۔ اور اسلام کے اصولِ اقتصاد اور انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ کسی سے اس کی ساری نجی ملکیت کو طلب یا جبراً سلب کر لیا جائے۔ قرآن کریم اپنے حکیمانہ انداز میں فرماتا ہے:۔

وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم ہ ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم۔ (محمد: ۳۶، ۳۷)

اور اگر تم ایمان و تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور تم سب سے تمہارا سارا مال طلب نہیں کرے گا۔ اور اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے۔ پھر انتہا درجہ تک طلب کرتا رہے۔ تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ (اس طرح) تمہارے مال صرف کرنے کی فطری ناگواری کو ظاہر کر دے۔

غرض اسلام نے نہ تو نجی ملکیت کو قطعاً ختم کیا نہ اسے بالکل آزاد و بے لگام چھوڑا بلکہ عادلانہ قوانین کے اجرا سے اسے ایسا مقید و پابند کر دیا کہ دولت کی ناہموار تقسیم ختم

ہوگی۔ نہ تو قارونی دولت نے ایسے مواقع چھوڑے کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے، نہ نجی ملکیت کا انکار کر کے انسانی فطری ساخت کے خلاف ہر چیز کا مالک مملکت کو اور عملاً ایک طبقے کی جماعت کے نمائندوں کو اس کا متصرف بنایا۔ اس سلسلے میں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو عہدِ آفریں منصفانہ معاشی خاکہ پیش کیا، اس کے موٹے موٹے خط و خال اس مختصر نشست میں پیش کرتا ہوں۔

اوّلاً نجی ملکیّت سے بہت ساری چیزوں کو خارج فرما کر انھیں وقفِ عام کر دیا جس سے ہر انسان مساوی فائدہ اُٹھانے کا حق دار ہے۔ اور وہ انفرادی ملکیت میں نہیں دی جاسکتیں۔ ان چیزوں میں آگ، پانی، مٹّی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس، جنگل اور پانی کا شکار، معادن (کانیں)، غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں بعض چیزوں کے استعمال کا حق دار ہر شخص ہے اور بعض اشیا سے اسلامی مملکت کے آمر کی اجازت سے مصالحِ عامّہ کو پیشِ نظر رکھ کر استفادہ کیا جائے گا۔

معادن میں فقہا کی تصریح کے مطابق نمک، گندھک، نارکول، نیل، سُرمہ، یاقوت وغیرہ جیسی دھاتیں شامل ہیں گویا اگر کوئی شخص اسے نجی طور پر آباد بھی کرے تو اس کا مالک نہیں ہوتا۔

ثانیاً: بعض آمدنیوں کو قطعاً حرام و باطل قرار دے دیا۔

قرآن کہتا ہے:

یا یہا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ (نساء: ۲۹)

(اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ)۔

ان باطل طریقوں میں سرِ فہرست سُود کا ہر قسم کا کاروبار ہے۔ جس کے جزو کل کو اسلام نے حرام قرار دے دیا۔ اور سود خوار کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم سے جنگ کا چیلنج دے دیا۔ سود کی بربادیوں کا حال ہر منصف مزاج معاشی سمجھ رکھنے والا شخص کر سکتا ہے۔ حاجت مند اور محتاج کو جس طرح یہ لوٹتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ چالیس سال میں اگر پانچ فی صدی بھی شرح سود ہو تو سود مفرد میں محتاج سے یہ سو کی بجائے تین سو اور مرکّب سود میں سات سو وصول کرتا ہے۔

شرح سود کی زیادتی و کمی اور ان کے پھیلاؤ کے بقدر اشیا کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے ہوتی ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ بنکاری سود ہی کا کمال ہے کہ بیس سال کے عرصے میں پاکستان کی مجموعی دولت کا ۹۵ فیصد حصہ بائیس خاندانوں کے ہاتھ میں سمٹ آیا اور ابھی ھل من مزید کی صدا آرہی ہے۔

قمار (جوئے) کی ہر صورت اور سٹہ بازی کو جس سے تاجر کروڑوں کے وارے نیارے کرتے ہیں اور ہر پل بھر میں امیر بنا دینے والے داؤ کو حرام کر دیا۔

احتکار (یعنی ذخیرہ اندوزی) کو حرام قرار دیا۔ رشوت، لوٹ کھسوٹ اور ہر قسم کے جبر و اکراہ سے حاصل کردہ مال کو ناجائز قرار دیا۔

گویا ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام کی ان تمام بنیادوں کو اکھیڑ دیا جن سے امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے۔

آمدنی کے ذرائع محدود کرنے کے ساتھ اخراجات کی راہ کشادہ کر دی اور قانوناً دین بنا کر مال کی تقسیم کے طریقے مقرر کر دیے، جس سے مال چند اشخاص کے بجائے پورے معاشرے میں پھیلتا جاتا ہے۔ اور غریب کی حاجات اس طرح پوری ہو جاتی ہیں کہ وہ خود تونگر اور مال دار بن جاتا ہے۔ ان میں بڑی بڑی مدات یہ ہیں۔

زکوٰۃ: سونے چاندی اور تجارتی مال کے اصل پر ڈھائی فی صد سالانہ کے حساب سے مفلس اور ناداروں کے لیے ان کا حق قرار دے کر جو مال نکالا جاتا ہے، اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔

۱۹۶۹ء میں G.N.P. قومی آمدنی بہتر ہزار کروڑ تھی۔ اگر صرف اس پر ہی زکوٰۃ نکال لی جائے تو ۱۸۰ کروڑ بنتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ افلاس کو ختم کر دینے میں مال دار اگر کروڑوں روپے کے سونے کا مالک ہو اور نمو کی تجارت میں سرمایہ نہ لگائے، تو اس کا یہ سارا سرمایہ چالیس سال میں غریب اور نادار کی جیب میں چلا جائے گا۔ مال کی طرح زمین سے نکلنے والی ہر پیداوار، پھل، سبزی، ترکاری، جوٹ، کپاس وغیرہ میں سے دسواں، بیسواں حصہ غریب کا حق ہے۔ قرآن کہتا ہے: فی اموالھم حق للسائل والمحروم ۔ (اس میں مانگنے والے اور محتاج کا حق ہے۔) اگر مصنوعی ذرائع سے کاشت ہے۔ تو بیسواں حصہ

غریب کا مال ہے۔ ورنہ دسواں حصّہ۔ اسی طرح چوپایوں، اونٹ، بکری، بھیڑ، گائے بھینس وغیرہ پر بھی زکوٰۃ ہے۔ جس پر رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کے لکھے ہوئے احکام و فرامین اب تک موجود ہیں۔ دفینوں اور معدنیات کی آمدنی کا پانچواں حصّہ ناداروں اور غریبوں کا حق ہے۔ اس کے علاوہ صدقۂ فطر، کفارات وغیرہ کی کئی آمدنیاں غریبوں اور ناداروں میں تقسیم ہوں گی۔

حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

توخذ من اغنیاءھم وترد علٰے فقراءھم۔

(ان کے امیروں سے لے کر یہ زکوٰۃ اور اس قسم کی دیگر مدات کی رقمیں فقرا میں تقسیم ہوں گی۔

یہ رقم بیت المال میں جمع ہو کر انھی مصارف پر صرف کی جائے گی، جن کی قرآن نے تصریح کی ہے۔ بیت المال سے حاجت مندوں کو ضرورت کے وقت اس رقم سے قرضہ وغیرہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ اجتماعی خزانہ ہے، جو ہر فرد کے لیے ضرورت کے وقت اس کی کفالت کرتا ہے۔ اور مصنوعی اور ناجائز ہیموں اور سودی کاروبار سے انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے میں ہر شیر خوار بچّے کو بیت المال سے دو سو درہم ماہوار وظیفہ دیا جاتا تھا اور بڑوں کے مختلف حیثیتوں سے وظائف مقرر تھے۔ یہ بیت المال ہر شخص کی روٹی، کپڑا، صحت و مسکن اور دیگر ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

اسلام میں میراث کا قانون تقسیمِ دولت میں بڑا اہم کردار انجام دیتا ہے۔ بڑی بڑی جائز زمینداریاں بھی دو تین نسلوں یعنی پچاس ساٹھ سال میں تقسیم در تقسیم کے عمل سے ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

زمینوں کے ناجائز عطیات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر جاگیریں اس کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ غیر آباد زمینیں آباد کرنے والے کا حق ہیں۔ زمیندار پر لازم ہے کہ کاشتکار کے حقوق کی رعایت کرے اور کاشتکار کی اجیر کی حیثیت ہے جس پر لازم ہے کہ مالک کا حق ادا کرے۔

اسلام نے آجر اور اجیر، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار کا تعلق

طلب و رسد کی بنا پر قائم نہیں کیا۔ بلکہ بھائی چارے کی اسلامی بنیادوں پر اُٹھایا ہے۔ فرمایا جو خود کھاؤ اس کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو اُسے پہناؤ۔ اسے برے لقب سے عبد کہہ کر نہ پکارو۔ بلکہ اسے بھائی کہہ کر خطاب کرو۔ قانونی دفعات کے علاوہ اسلام نے اخلاقی لحاظ سے صدقہ، خیرات و انفاق پر اس قدر زور دیا ہے کہ بعض اسلامی مفکّرین نے اسلامی نظریۂ معاش کو نِرا اَلفاقی نظریۂ معاش قرار دے دیا ہے۔ محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ صحابہ خود بھوکے رہ کر اوروں کو کھلا دیتے تھے۔ خود حضور انورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دہش کا یہ حال تھا کہ جب ایک سائل کے سوال پر اسے بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ دے دیا۔ تو وہ بے اختیار پکار اُٹھا " اے لوگو! اسلام لے آو۔ محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ اس کے بعد ناداری کا خوف نہیں رہتا"

مختصر وقت میں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے سراپا رحمت نظامِ معیشت پر پوری گفت گو کرنا مجھ جیسے بے علم کے لیے مشکل تھا۔ تاہم اتنی بات کہے دیتا ہوں کہ جس کے پاس اسلام کا عادلانہ نظام موجود ہے، وہ کسی دوسرے نظامِ معاش و اقتصاد کو گوارا نہیں کر سکتا اور جس کے پاس حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلّم جیسی شخصیت موجود ہو، وہ مارکس و انجیلز، لینن، ماؤزے تنگ کی شخصیات پر نگاہ نہیں کر سکتا ہے ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ٥

شامِ ہمدرد، پشاور
شنبہ۔ ۲ مئی ۱۹۷۰ء ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ حیثیت منصف اور قانون ساز

جناب جسٹس شیخ عبدالحمید صاحب

اگرچہ زمانۂ تخلیق کو ناپنے کا کوئی آلہ موجود نہیں ہے، تاہم سائنس دانوں کی قیاس آرائی کے مطابق "انسان" کو اپنی موجودہ شکل وصورت میں اس کرۂ ارض پر وجود میں آئے تقریباً دس ہزار سال گزرے ہیں۔ وہ شروع دن سے خوراک ومکان کی تلاش میں صحرانوردی کی زندگی بسر کرتا رہا اور جب بھی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوئی، اس نے انسانی خون بہانے سے احتراز نہ کیا۔ اس کی اس صورتِ حالات کا ذکر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے مابین مکالمے کے انداز میں موجود ہے۔ جب فرشتوں کو اس رضائے الٰہی کا علم ہوا کہ وہ "انسان" کو تخلیق کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو انھوں نے دریافت کیا: "اے رب العالمین! کیا تو ایک ایسی ہستی کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو کرۂ ارض پر ہر روز ایک نیا ہنگامہ کھڑا کرے گا اور خون بہانے سے باز نہیں آئے گا۔"

فرشتوں کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ زمین پر قدم رکھتے ہی انسان نے اشیائے خوراک اور عورت کے لیے خون بہانا شروع کر دیا اور آج تک وہ اسی راہ پر گامزن ہے۔

اس وقت کوئی سیاسی ادارہ ایسا نہ تھا جو معاشرے میں امن وعافیت اور نظم ونسق قایم رکھتا اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی اور خلاف ورزیوں کو دیکھ کر ان کی روک تھام

کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہم کام اپنے پیغمبروں کے سپرد کر دیا جن کو وہ وقتاً فوقتاً روئے زمین پر بھیجتا رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، جو دنیا کے سب سے پہلے قانون ساز تھے، آسمانی احکام لے کر آئے جن کی رُو سے قتل و غارت گری، چوری اور بدکاری کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ان کے بعد دوسرے پیغمبر اعلیٰ خیالات کی تبلیغ کے لیے آئے اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ چوں کہ اللہ کے پیغامات اور احکام انسانوں تک پہنچانے کے لیے وہ آخری نبی تھے اور چوں کہ ان کے پیغامات اور قوانین کو ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے مفید اور کارآمد بنانا تھا، اس لیے ان کے دائرۂ عمل کو بھی ان کے پیش روؤں کے مقابلے میں وسیع تر رکھنا تھا۔ لہٰذا وہ زمان و مکان کی بندشوں سے قطعِ نظر انسانی زندگی کے تقریباً سب ہی پہلوؤں پر اثر انداز رہے اور آں حضرتؐ کا ضابطۂ قانون ایک مکمّل دستاویز بن گیا۔ آپ نے وحی الٰہی کی زیرِ ہدایت جن اصول و فروع کو بیان فرمایا اُن کی حیثیت مستقل اور دائمی ہے، البتہ جن امور کے بارے میں شریعت خاموش ہے اُن امور کے بارے میں اصولِ دین اور رُوحِ شریعت کے مطابقت میں اجتہادی آرا پیش کی جا سکتی ہیں۔

چناں چہ دینِ اسلام کو قوانین و اخلاقیات کے ایسے بنیادی اصول وضع کرنے تھے جو وقتاً فوقتاً اور جگہ بہ جگہ تفصیلات سے متعلق قاعدے مرتب کرانے میں مدد دیتے اور جو اس وقت کے حالات کا ساتھ دینے کے لائق ہوتے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے جو احکام درج ہیں، ان سے مسلمان قانون سازوں نے پانچ بنیادی اصول اخذ کیے جو آئین کے سب پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اسلام میں آئین سازی کا مقصد یہی ہے کہ ان اصولوں کی تعمیل کرائی جا سکے۔ ان اصولوں کو شرع میں "کلیاتِ خمسہ" کہا جاتا ہے جو مختصراً یہ ہیں:

(۱) زندگی کا تحفّظ۔

(۲) جائیداد کا تحفّظ۔

(۳) دین کا تحفّظ۔

(۴) وراثت کا تحفّظ اور

(۵) فکر و استدلال کا تحفّظ۔

مسلمان آئین سازوں کے حساب کے مطابق قرآنِ پاک میں دو سو ستائیس آیات

گیارہ قانونی معاملات مثلاً میراث، شادی، جہیز، طلاق، تحائف، وصیت، خرید و فروخت، سرپرستی، کفالت اور ارتکاباتِ جرم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس بدلتی ہوئی اور ترقی پذیر دنیا کے لیے صرف یہ تشقیں کافی نہیں کہی جا سکتیں۔ لہٰذا قرآنِ پاک تمام مختلف التنوع حالات کے لیے قوانین مرتب نہیں کر سکا جو مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر پیش آ سکتے تھے۔ یہ بات آنے والے دور کے قانون سازوں کے لیے چھوڑ دی گئی تاکہ وہ بنیادی اصولوں کی روشنی میں تقاضائے وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے دوسرے قوانین مرتب کر لیں بشرطیکہ وہ دوسرے قرآنی احکام کے عین مطابق ہوں۔

رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم اسلام کے اوّلین قانون ساز تھے۔ انھوں نے اس ضمن میں مسلمانوں کی راہ نمائی کی۔ انھوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کا لحاظ رکھا۔ ان کے قانونی ملفوظات دوسرے آسمانی قوانین کا ذریعہ بن گئے جن پر تمام اسلامی آئین کی بنیاد قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ احکام بھی نافذ ہیں کہ تمام مسلمان فرمانِ رسولؐ کی پیروی کریں۔ قرآنِ پاک میں آیا ہے:

وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ (۵۹:۷)

(جو کچھ رسولؐ تم کو دے، مضبوطی سے پکڑے رہو اور اسے ترک کرو جس سے وہ منع کرے۔)

اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ بھی ہے:

من یطع الرّسول فقد اطاع اللہ

(جس نے رسول کی اطاعت کی فی الحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی)

اسی لیے کہا جاتا ہے اور یہ کہنا صحیح بھی ہے کہ کوئی مملکت اسلامی نہیں کہی جا سکتی اگر اس کے قوانین قرآن و سنّت سے متضاد ہوں۔ سنّت سے مراد ہر وہ بات ہے جو نبیؐ نے کہی، ہر وہ فعل ہے جو اس نے کیا اور وہ رائے بھی جو دوسروں کے بارے میں قایم کی گئی۔

اس مقالے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک آئین اور قانون ساز کی حیثیت سے کیا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے جو بھی کردار ادا کیا، وہ ہر زمانے اور مقام کے باشندوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جہاں کہیں

بھی اسلامی آئین نافذ کرنا مطلوب ہو، وہ لازمی طور پر قرآنی احکام اور سنّتِ رسولؐ کی روح کے عین مطابق ہونا چاہیے۔

خرید و فروخت اور معاہدے

علمِ قانون کے جتنے بھی مہذّب نظام دنیا میں رائج ہیں، اِن سب میں معاہدے کا سب سے اہم عنصر "رضامندی" ہوتا ہے۔ لیکن قانون کی رو سے رضامندی کا مفہوم اس شخص کی رضامندی سے ہوتا ہے جو زیرِ معاہدہ لین دین سے ظہور میں آنے والے نفع و نقصان کا صحیح اندازہ لگانے کا اہل ہو۔ اس ضمن میں رسولِ اکرم صلعم نے فرمایا کہ جب رضامندی کو کسی معاہدے کی شرط قرار دیا جائے تو وہ کسی دباغت، فریب اور غلطی کے بغیر بالکل آزادانہ ہو۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: "میری امّت کو اس ذمّے داری سے سبک دوش کر دیا گیا ہے جو کسی قسم کی دباعت، فریب اور غلطی سے ظہور میں آتی ہے۔" اس اصول کی تہ میں اصل منشا یہ ہے کہ معاہدے میں شریک ایک فریق کو بے جا نقصان سے بچایا جائے۔ منصفانہ اور مناسب لین دین کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی فریق مال چھوڑ دینے سے کوئی نقصان اٹھا رہا ہو تو اسے بدلے میں برابر قیمت کا فائدہ بھی ضرور پہنچنا چاہیے۔ ایک مشہور قانون دان اور فلسفی بینتھم کے بیان کے بموجب "نقصان سے جو تکلیف لاحق ہو، اس کا مداوا بدلے میں حاصل ہونے والی راحت سے کیا جائے۔"

ایسے دھوکے اور فریب سے بچانے کے لیے جس سے ایک فریق کو نقصان پہنچتا ہو اور کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو، رسول اللہ صلعم نے حکم نافذ کیا کہ فروخت کی جانے والی چیز فروخت کے وقت موقع پر موجود ہو اور معائنے کے لیے پیش کی جا سکے۔ اگر وہ اس وقت موجود نہ ہو اور بعد میں مہیّا کی جانے والی ہو تو واضح طور پر اس کی خوبی اور مقدار کی تفصیل بیان کر دی جائے۔ اس ضمن میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کے قبضے میں ہونی چاہیے۔ قبضہ دیے جانے سے متعلق تنازعات کو ختم کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہ یقین دلانے کے لیے کہ بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کی ملکیت ہے اور کسی اور کا اس پر حق نہیں ہے، انھوں نے فرمایا کہ منڈی میں ایک جگہ سے فروخت کے لیے خریدے جانے والا اناج لازمی طور پر منڈی میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اسے صاف طور پر اس ذریعے سے الگ کر دینا چاہیے جس سے فروخت کنندہ نے اسے خریدا تھا۔

معاہدۂ فروخت کو فسخ کرنے کے اختیار کے بارے میں آں حضورؐ نے فرمایا کہ جب تک دونوں فریق لین دین کے مقام سے چلے نہ جائیں، فسخ کرنے کا اختیار انھیں حاصل ہے لیکن اگر کسی اور صورت میں اس اختیار کو کام میں لانے سے متعلق کوئی شرط معاہدے میں درج ہے تو پھر وہ شرط ان کو پابند کیے رہے گی۔

انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ فروخت کی جانے والی شے میں کوئی نقص ہو تو اُسے ظاہر کر دیا جائے۔ اگر نقص ظاہر نہ کیا جائے اور خریدنے والا بعد میں اس حقیقت کا پتا لگا لے تو اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ اس نقص کے انکشاف پر معاہدے کو منسوخ کر دے۔

انھوں نے لین دین کے ان تمام معاملات کو غیر قانونی قرار دے کر ان کی مذمت کی جن میں قیاس آرائی یا سٹّے بازی کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ اس زمانے میں بعض لوگ اپنی دوکانوں میں فروخت کے مال کو پھیلا دیا کرتے اور خریدار اُن چیزوں پر کنکریاں پھینکتا جن کو وہ خریدنا چاہتا تھا۔ اور کنکری جس چیز پر لگ جاتی، وہ فروخت شدہ سمجھی جاتی تھی۔ آں حضورؐ نے اس طریقِ کار کو ممنوع قرار دیا کیوں کہ اس میں قمار بازی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اسی سبب سے رسول اللہ صلعم نے ان جانوروں کی فروخت کو ممنوع قرار دیا جو شکمِ مادر میں ہوں، ان پھلوں کی فروخت کو جو غیر پختہ ہوں اور مچھلیوں کی فروخت کو جو پانی میں ہوں۔ پھلوں کو فروخت کرنے کی اجازت اسی صورت میں دی گئی کہ جب وہ توڑے جانے کے لائق حد تک پختہ ہو گئے ہوں۔

انھوںؐ نے اناج کی ذخیرہ اندوزی کو اور کمیابی پیدا کرنے کی غرض سے اس کی فروخت روکے رکھنے کو اور پھر زیادہ نرخ پر بیچنے کو ممنوع قرار دیا۔ انھوںؐ نے ایسے مادہ جانوروں کو فروخت کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جن کا دودھ دو یا تین دن تک نہ دوہا گیا ہو، کیوں کہ اس میں فریب کا عنصر پایا جاتا ہے۔

تازہ کھجوروں کا خشک کھجوروں سے تبادلہ یا ان کھجوروں کا جو ڈھیر کی صورت میں پڑی ہوں ان کھجوروں سے جو حقیقتاً تولی جا چکی ہوں، تبادلہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا کیوں کہ اس قسم کے لین دین میں بھی قیاس آرائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اہلِ مدینہ کا دستور تھا کہ ان لوگوں سے ملنے کے لیے شہر کے باہر جاتے جو دوسرے مقامات سے فروخت کا مال لے کر آتے اور وہیں ٹھہرا کر ان سے سودا کر لیتے تھے۔ انھوںؐ نے اس رواج

کو ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ باہر والوں کو اپنا مال منڈی میں لانے اور وہاں پہنچ کر فروخت کرنے کا موقع دیا جائے۔

انھوںؐ نے فروخت کو فسخ کرنے کا حق صرف ان باہر والوں کو دیا جن کو منڈی میں پہنچنے کے بعد معلوم ہو کہ منڈی میں چیزوں کا نرخ اس شرح سے بڑھا ہوا ہے جو ان کو وصول ہوئی تھی۔

انھوںؐ نے ایک ایسی چیز پر بولی لگانے کی اجازت نہیں دی جس پر کسی دوسرے شخص سے بات چیت ہو رہی ہو۔ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ بولی دینے والا صرف فروخت کنندہ کے مفاد کی خاطر قیمت بڑھانے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔

اگر بیچنے والے کے ایما پر کوئی چیز دو اشخاص کے ہاتھ فروخت کر دی گئی ہو تو پہلے خریدار کو اسے پا لینے کا حق حاصل ہو گا۔

اگر درخت پر لگے ہوئے پھل فروخت کر دیے جائیں اور پھر قدرتی آفات کے باعث تباہ ہو جائیں بیشتر اس کے کہ خریدار ان کو توڑ کر جمع کر سکے تو خریدار کو وہ رقم واپس لینے کا حق حاصل ہو گا جو اس نے قیمت کے طور پر ادا کی ہو۔

آں حضرت صلعم کے فرمان کے بموجب کسی ایسے کام کی اجرت طلب کرنا ناجائز ہے جو بجائے خود حرام ہو مثلاً بت بنانا یا شراب کشید کرنا۔ کسی مورت، یا شراب یا کتے کی فروخت پر کسی قیمت کا مطالبہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سود کا مطالبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

انھوںؐ نے اس قانونی اصول کو ایک خوب صورت جملے میں بیان کیا ہے: "نفع ذمے داری کے ساتھ ملتا ہے۔" ایک شخص نے ایک غلام خریدا لیکن غلام کا نقص خریدار پر منکشف نہیں کیا گیا۔ نقص کا انکشاف ہونے پر خریدار نے وہ غلام فروخت کنندہ کو واپس کر دیا۔ اس درمیانی وقفے میں غلام نے جو کام انجام دیا، اس کی اجرت فروخت کنندہ نے طلب کی آں حضرت صلعم نے یہ فرما کر اس مطالبے کو رد کر دیا کہ "نفع ذمے داری کے ساتھ ملتا ہے۔" خریدنے والا غلام کو کھانا کھلانے کا ذمے دار تھا۔ اسے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اس درمیانی وقفے میں وہ (بھوک سے) مر جاتا تو نقصان اٹھانا پڑتا۔

انؐ کے قاعدے کے مطابق فروخت کنندہ کو اپنی بیچی ہوئی چیز کی قیمت وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔

اگر خریدنے والے اور بیچنے والے کے درمیان کسی چیز کی فروخت پر کوئی تنازعہ کھڑا ہو

جائے اور وہ چیز اس وقت موجود ہو تو اس صورت میں رسول اللہ صلعم کے قاعدے کے مطابق بیچنے والے کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا۔ اس صورت میں خریدار کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اس بیان کو قبول کرے یا رد کر دے۔ اگر وہ قبول کرلے تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اگر رد کر دے تو وہ چیز فروخت کنندہ کو واپس مل جائے گی۔ یہ ایک مشہور قانونی اصول کی عمدہ مثال ہے جس کے تحت دونوں فریق سابقہ حالت پر واپس چلے جاتے ہیں۔

علمِ قانون کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ لین دین کے تمام معاملات میں نفع نقصان دونوں فریقوں کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ اگر ایک شخص کو نفع ہو اور دوسرے کو کلیتہً نقصان ہو تو اس اصول کے تحت وہ لین دین کالعدم ہو جاتا ہے۔ آں حضرت صلعم کے جاری کردہ احکام میں یہ قانونی اصول اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

دیوالیہ ہونے کا قانون

آں حضرت صلعم نے قانون کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے ایک صحابی حضرت معاذ رضؓ کی جائیداد اپنے قبضے میں کرلی جو دیوالیہ ہو گئے تھے، اسے فروخت کر دیا اور فروخت کی رقم کو قرض خواہوں میں تقسیم کر دیا۔ انھوں نے یہ حکم بھی دیا کہ اگر کوئی قرض خواہ اپنا مال کسی دیوالیہ مقروض کے قبضے میں پائے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ اس سے واپس لے لے۔ یہ اصول زیادہ قرین انصاف ہے دیوالیہ پن کے اس اصولِ قانون کی بہ نسبت جو اس وقت رائج ہے اور جس کے تحت ایسی چیز کی قیمت دوسرے قرض خواہوں میں بھی تقسیم ہو جاتی ہے۔

اس فرمان کے بموجب کنوئیں کا پانی، خودرو گھاس اور آگ مشترک املاک ہیں۔ ایک دیا سلائی کسی دوسرے شخص کی آگ سے روشن کی جاسکتی ہے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ آگ بجھ جائے۔ نہر میں بہتے ہوئے پانی کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ وہ ساحلی کھیتوں کے سب مالکوں کی ملکیت ہے۔ البتہ ایک شخص اپنے کھیت میں آب پاشی کے لیے نہر کا پانی اس وقت تک روک سکتا ہے جب تک کہ کھیت میں وہ پانی ٹخنوں تک نہ آجائے۔

انھوں نے دوسرے لوگوں کی زمین پر مداخلتِ بے جا کو ممنوع قرار دیا۔ البتہ انھوں نے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا قطعۂ زمین ہو جو کبھی کسی کے قبضے میں نہ رہا ہو یا زیر کاشت نہ آیا ہو تو

کوئی بھی مسلمان اس پر کاشت کر سکتا یا اس کے گرد باڑ لگا سکتا یا دیوار چنوا سکتا ہے۔ یہ بات علمِ قانون کے اس مشہور اصول کے مطابق ہے جس کے تحت زمین پر "پہلے قابض" کی ملکیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

حق شفعہ کا قانون

رسولِ مقبول صلعم قانون کی اس شق کے شارع ہیں کیوں کہ انؐ سے قبل وہ کہیں بھی رائج نہیں تھی۔ انؐ کے وضع کردہ اس قانون کے تحت کسی جائیداد غیر منقولہ، زمین یا مکان کے ایک حِصّے دار کو یہ ترجیحی حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ساجھی کا حِصّہ خرید لے۔ اجنبی لوگ صرف دوسرے حِصّے داروں کی رضامندی پر یا خریداری سے ان کے انکار پر خرید سکتے ہیں۔ اسی اصول پر آں حضرتؐ نے خریداری کا ترجیحی حق ان لوگوں کا دیا جنھیں بیچنے والے کے ساتھ ساتھ فروخت ہونے والی جائیداد پر سے ہو کر گزرنے کا حق حاصل ہو۔ یہ قاعدے اس لیے وضع کیے گئے تاکہ اجنبی لوگوں کو حِصّے داری سے الگ رکھا جائے کیوں کہ ناپسندیدہ لوگوں کے داخلے سے عام طور پر جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس قاعدے پر عمل کرنے سے تنازعات کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

پٹّے پر اراضی

دنیائے عرب کے ایک عام رواج کے مطابق جب کوئی اراضی کاشت کے لیے کسی کرایے دار کو پٹّے پر دی جاتی تو پیداوار میں سے اس کرایے دار کا حِصّہ اس طرح متعیّن کیا جاتا کہ کھیت کا ایک حِصّہ اس کے لیے مخصوص ہو جاتا اور وہ اسی قطعۂ زمین کی پیداوار سے اپنا حِصّہ حاصل کر لیتا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کبھی کرایے دار کے حِصّۂ اراضی پر اور کبھی مالک کے حِصّۂ اراضی پر کوئی فصل بالکل تیار نہیں ہوتی یا اس کی مقدار اتنی نہ ہوتی کہ اس حِصّے دار کا معاوضہ کافی ہو جاتا جس کے لیے وہ مخصوص کی گئی تھی۔ یہ بھی ایک قسم کی قمار بازی کہی جا سکتی ہے۔ لہٰذا آں حضرتؐ نے اس رواج کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ سارے کھیت کی پیداوار ایک جگہ جمع کی جائے اور پھر مالک اور کرایے دار کے مابین ان کے متفقہ حصص کے مطابق تقسیم کر دی جائے۔ انھوںؐ نے اس بات پر اصرار کیا کہ حصص

کا تعین پہلے سے کر لیا جائے۔ انھوں نے ایک سال سے زیادہ مدت کے لیے بھی پٹے کی اجازت نہیں دی۔

اگر کسی درخت کے پھل پٹے پر دیے جائیں اور وہ پھل آفاتِ قدرتی سے ضائع ہو جائیں تو مالک کے لیے لازمی ہو گا کہ وہ پٹے کی رقم پٹہ لینے والے کو واپس کر دے۔

مالک اور ملازم

رسولِ مقبول صلعم نے اجرت کی ادائیگی پر خدمت لینے کی اجازت دی ہے چناں چہ وہ خود بھی بعثت سے پہلے اجرت لے کر اہلِ مکہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور انھوں نے ان لوگوں کو بھی اجرت ادا کی جو زمانۂ نبوت میں انؐ کے لیے خدمات انجام دیتے تھے۔ انؐ کا اصرار تھا کہ مزدور کی اجرت ادا کر و اس سے پہلے کہ اس کی پیشانی کا پسینہ خشک ہو۔

ہبہ

احادیثِ نبویؐ کے مطابق ہبہ کرنے کی اجازت ہے اور سوائے اس کے ایک باپ اس ہبہ نامے کی تنسیخ کر سکتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے کے نام میں تحریر کیا ہے، باقی تمام ہبہ نامے ناقابلِ تنسیخ ہیں۔ باپ کی طرف سے بیٹے کے نام ہبہ نامہ صرف اس وقت منسوخ ہو سکتا ہے کہ جب ہبہ کی ہوئی جائیداد بالکل اسی صورت میں موجود ہو جو ہبہ کرنے کے وقت تھی۔ لیکن اگر اسے کسی اور صورت میں بدل دیا گیا ہے، مثال کے طور پر ہبہ کی ہوئی اراضی پر عمارت تعمیر کر لی گئی ہے تو وہ ناقابلِ تنسیخ ہے خواہ وہ باپ ہی نے بیٹے کو دی ہو۔ اس امتیازی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون وضع کرنے والے کی دماغی صلاحیت کس درجے منصفانہ تھی۔

آپ کے حکم کے بموجب عمر بھر کے لیے وقف کرنے کی بھی اجازت ہے۔

لیکن انھوں نے ایسے وقف کی مذمت کی ہے کہ جب ایک وارث کو دوسرے وارثوں کے مقابلے میں ترجیح دی جائے۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ اس طرح اس وارث کے خلاف دوسرے وارثوں کے دلوں میں نفرت اور عداوت کے جذبات نشو و نما پاتے ہیں اور جس وارث کو ترجیح دی گئی ہے، وہ حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔

آں حضرتؐ نے خدا کے نام پر اراضی وقف کرنے اور مذہبی مقاصد کے لیے اسے بطور عطیہ دے دینے کی اجازت دی ہے۔

انھوں نے ایک مخصوص قسم کے مشروط عطیے کو بھی تسلیم کیا ہے جو شرع میں "رقبیٰ" کہلاتا ہے۔ وہ ایک ایسا عطیہ ہوتا ہے جس کے ساتھ اس قسم کی شرط لگائی جاتی ہے کہ اگر عطیہ پانے والا عطیہ دینے والے سے پہلے مر جائے تو عطا کی ہوئی جائیداد عطیہ دینے والے کو واپس مل جاتی ہے لیکن اگر عطیہ دینے والا پہلے مر جائے تو جائیداد عطیہ پانے والے کی قطعاً ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس قاعدے کی خوبی بالکل واضح ہے۔

اگر کسی شخص کو ایسا کوئی سامان ملے جس کا کوئی دعوے دار نہ ہو تو وہ اس پر قابض ہو سکتا ہے لیکن ایک حدیث کے مطابق اس کا فرض ہو گا کہ وہ چالیس دن تک اس کا اعلان کرتا رہے اور ایک دوسری حدیث کے مطابق ایک سال تک اعلان کرتا رہے۔ اگر اصل مالک حاضر ہونے سے قاصر رہے اور سامان کا کوئی دعوے دار نہ ہو تو پھر وہ سامان اس شخص کا ہو جائے گا لیکن اگر اصل مالک آجائے اور سامان کا مطالبہ اس وقت کرے جب کہ وہ استعمال میں آگیا ہو تو استعمال کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اصل مالک کو اس کی قیمت ادا کر دے۔

لیکن آں حضرتؐ نے ضروری اعلان اور تشہیر کے بغیر سامان کے تصرّف کی مذمت کی ہے کیوں کہ ایسا فعل امانت میں خیانت کے مترادف ہے۔

آپؐ نے اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ اس اعلان پر دو گواہوں کی تصدیق ہونی چاہیے تاکہ بے دعویٰ جائیداد پانے والے کو کہیں اس کے ناجائز تصرّف کی ترغیب نہ ہو جائے۔ اور اگر مدعی سامان پانے والے کی وفات کے بعد اپنا دعویٰ لے کر آئے تو مرنے والے کے ورثا اسے اپنے باپ کی املاک سمجھ کر اس پر قابض نہ رہیں۔

وصیّت

آں حضرتؐ نے ایسے وارثوں کے حق میں وصیت کرنے کو منع فرمایا ہے جو فرمانِ الٰہی کے بموجب پہلے سے وارث ہوں کیوں کہ اس طرح دوسرے وارثوں کے حصص میں کتر بیونت ہو سکتی ہے۔ وہؐ وصیت کے ذریعے جائز وارثوں کو نقصان پہنچانے کے خلاف تھے اور ان کے نزدیک ایسا فعل احکامِ الٰہی میں مداخلت کے مترادف ہے۔ ان کا منشا یہ

بھی تھا کہ ترجیحی حیثیت پانے والے وارث کسی طرح رشک و حسد کا نشانہ نہ بنیں۔

وراثت

ایک حدیثِ نبویؐ کے مطابق کوئی مشرک وارث کسی مسلمان کے مال و متاع کا وارث نہیں بن سکتا اور اسی طرح کوئی مسلمان وارث کسی مشرک رشتے دار کی جائیداد کا وارث قرار نہیں پا سکتا۔

کوئی مسلمان کسی ایسے شخص کے مال و متاع کا وارث نہیں بن سکتا جسے اس نے مار ڈالا ہو۔ ایسی ممانعت کے بغیر یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وارث جلد حقِ وراثت حاصل کرنے کے لیے کہیں اپنے اسلاف کو ہلاک نہ کر دیں۔

آں حضرت صلعم کے وضع کردہ ایک اور قاعدے کے مطابق اگر کوئی وارثِ جائیداد شکمِ مادر میں ہے تو اس کی پیدائش کے وقت تک متوفی کی جائیداد پر حقِ وراثت کے فیصلے کو ملتوی رکھا جائے۔ اگر وہ زندہ پیدا ہو تو جائیداد پر اس کا حق ہوگا اور اگر وہ مردہ پیدا ہو تو اس کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ ان کے قاعدے کے مطابق وہ بچہ مردہ تصور ہوگا جو شکمِ مادر سے باہر آنے کے بعد چیخ کر رونے سے پہلے مر جائے۔ اس موقع پر چیخ کا سنائی دینا زندگی کی علامت ہے۔ اگر وہ چیخ سنانے کے بعد مر جائے تو اسے زندہ پیدا ہونے والوں میں شمار کیا جائے گا۔

ایک ناجائز طور پر پیدا ہونے والا لڑکا وارث نہیں ہوتا، اسی طرح وہ بچہ جو ایسے تعلقات کے بعد پیدا ہو جن کے بارے میں جماع کا فعل موضوعِ بحث ہو یعنی عورت و مرد بدکاری کا ارتکاب کریں اور اس بدکاری کے نتیجے میں بچہ پیدا ہو تو وہ وارث نہیں ہوگا۔

شادی یا نکاح

آں حضرت صلعم نے اس بات پر زور دیا کہ ہر وہ شخص جو مہر ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور بیوی کا خرچ برداشت کر سکتا ہو، ضرور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو۔ مہر کی رقم نقد یا سامان کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

لیکن انھوں نے تبادلے کی شادیوں کو ممنوع قرار دیا جن میں مہر کی کوئی رقم نقد یا سامان کی صورت میں نہیں دی جاتی بلکہ ایک شخص اپنی بہن دوسرے شخص کے نکاح میں

دینا اور اس کے عوض اس کی بہن کو اپنی بیوی بنا لینا ہے۔

فرمانِ رسول صلعم کے مطابق مہر ایک قرضہ ہے اور اسے تمام دوسرے قرضوں پر ایک ترجیحی حیثیت حاصل ہے اور وہ نکاح کے ضمن میں ایک لازمی شرط ہے۔

فریقین کی مرضی کے بغیر کوئی نکاح باضابطہ نہیں ہوتا۔ شادی کی تجویز پیش ہونے پر کسی فریق کا خاموش رہنا رضامندی کے مترادف سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر لڑکی کم سن ہو تو باپ کی رضامندی ضروری ہے۔

انھوںؐ نے نکاح سے پہلے لڑکی کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔

نکاح کے لیے دو گواہ ضروری ہیں۔

قرآنِ پاک میں مذکور جن رشتے داروں کے مابین شادیوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، ان کے علاوہ آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ وہ امتناعی حکم دودھ شریک رشتے داروں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ گویا رضاعی رشتے دار حقیقی رشتے داروں کے برابر حیثیت رکھتے ہیں۔

انھوںؐ نے ایک ایسی عورت کے ساتھ نکاحِ ثانی کو بھی ممنوع قرار دیا جو موجودہ بیوی کی خالہ یا پھوپھی یا بھانجی یا بھتیجی ہو۔

انھوںؐ نے رشک و حسد سے بچانے کی خاطر لوگوں کو منع فرمایا کہ کسی ایسی لڑکی کے لیے شادی کا پیغام نہ بھیجیں جس سے کسی اور شخص کی شادی کی بات چیت پہلے سے چل رہی ہو۔

انھوںؐ نے شادی کی تشہیر کے لیے تاکید کی تاکہ جس قدر زیادہ وسیع پیمانے پر ممکن ہو، لوگوں کو اس حقیقت کا پتا لگ جائے۔

طلاق

آں حضرت صلعم نے طلاق کی مذمت کرتے ہوئے، خدا کے نزدیک اسے سب سے زیادہ قابلِ نفرین فعل قرار دیا۔ اس کی اجازت صرف اسی صورت میں دی گئی کہ جب ایسا نہ ہونے کی حالت میں ازدواجی زندگی ناقابلِ برداشت ہو۔

لیکن اگر نکاح کی رسم ادا ہونے پر مہر کی کوئی رقم مقرر نہ کی گئی ہو تو طلاق نہیں ہو سکتی۔ تب علاحدگی کی کارروائی کے لیے طلاق ضروری نہیں ہو گی۔

لیکن دورانِ حمل میں کسی عورت کو طلاق نہیں دی جا سکتی یعنی جب تک بچہ رحم سے

باہر نہ آجائے ایسا نہیں ہو سکتا۔

مطلّقہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نکاحِ ثانی سے احتراز کرے جب تک کہ عدّت کا زمانہ ختم نہ ہو جائے اور اس دوران میں خاوند کو اس کی کفالت کرنی ہو گی۔

وہ شوہر جس نے کسی عورت کو طلاق دے دی ہو، اسی عورت سے دوبارہ شادی نہیں کر سکتا تا وقتیکہ وہ عورت کسی اور شخص سے شادی نہ کر لے اور اس سے طلاق لے کر زمانۂ مدت ختم نہ کر لے۔ یہ تاکید اس لیے کی گئی ہے تا کہ لوگ تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر طلاق دینے میں جلد بازی سے اجتناب کریں۔

ہرجانہ

اگر کسی شارعِ عام پر کوئی جانور کسی شخص کو زخمی کر دے تو جانور کا مالک زخمی ہونے والے کو تاوان ادا کرنے کا ذمّے دار ہو گا۔ یہ ہرجانے کے مروّجہ قانون کے اصول کے عین مطابق ہے جس کے بموجب جانوروں کے مالکان پر یہ ذمّے داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ اپنے جانوروں کے طرزِ عمل کا خیال رکھیں گے۔

فوج داری قانون

اگرچہ قرآنِ پاک میں تمام جرائم گنوائے گئے ہیں اور ہر جرم کی سزا متعیّن کی گئی ہے۔ تاہم رسولِ مقبول صلعم نے فوج داری قانون کے چند اصول بیان کیے ہیں۔

انھوں نے موت کی سخت سزا مقرر کی ایک ایسے شخص کے لیے جس کی بیوی موجود ہو اور کسی دوسری عورت کے ساتھ بدکاری کرے۔ قرآن پاک میں بدکاری کی یہ سزا مقرر کی گئی ہے کہ صرف ایک سو کوڑے مارے جائیں۔ لیکن رسولِ مقبول صلعم نے بدکاری کی دو واضح قسموں کے درمیان امتیاز قائم کیا ہے: ایک وہ بدکاری جو کنوارا شخص کرے اور ایک وہ بدکاری جو شادی شدہ شخص کرے موخر الذکر کی چوں کہ ایک بیوی موجود ہوتی ہے، اس لیے اس فعلِ مذموم کے ارتکاب کا کوئی جواز اس کے لیے نہیں ہے۔

انھوں نے ایک ایسے مسلمان کے لیے بھی سزائے موت مقرر کی جو مشرک ہو جائے۔

انھوں نے ہر شخص کو اپنی مدافعت کا حق دیا اور اس پر عمل کرتے ہوئے اختیار دیا کہ

وہ حملہ آور کو زخمی کر سکتا ہے۔ اس تکلیف کے عوض کسی تاوان کا مطالبہ اس سے نہیں ہو سکتا۔

وہ ایک عطائی کو اس شخص کی موت کا قصّے دار ٹھہراتے ہیں جو اس کے غلط علاج کے باعث فوت ہو گیا ہو۔ ایسی صورت میں اس پر صرف تاوان ڈالا جا سکتا ہے۔

اگر کسی حاملہ عورت کے خلاف جس کے رحم میں بچّہ ہو، سزائے موت صادر ہو تو سزا کی تعمیل میں اس وقت تک تاخیر کی جائے جب تک کہ وہ بچّہ جن کر فارغ نہ ہو جائے۔ تمام مہذّب ملکوں میں یہ قانون آج بھی رائج ہے۔

انھوں نے بدکاری کا ارتکاب ہونے پر ایک عورت کو سنگ سار کرنے سے بھی منع کیا جب کہ وہ ایک بچے کو اپنی چھاتی سے دودھ پلا رہی ہو۔ اس بات کی اجازت دی کہ بچّے کی شکم سیری کا مناسب انتظام کر دینے کے بعد اسے سنگ سار کیا جائے۔

اگر کسی حاملہ عورت کو مار ڈالا جائے تو رحمِ مادر میں مرنے والے بچّے کا قصاص بھی قابلِ ادائیگی ہوگا۔ یہ اس رائج الوقت قانون سے بہتر ہے جس کے بموجب رحم کے اندر مرنے والے بچّے کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔

مجھے کسی ایسے نظامِ قانون کا علم نہیں ہے جس کے تحت اس طور سے رحم کے اندر پرورش پانے والے بچّے کے قاتل پر تاوان ڈالا گیا ہو۔ دنیا میں بہت کم ایسے آئین ساز ہوں گے جو اس قدر جزئیات پر نظر رکھتے ہوئے انصاف چاہیں۔

انھوں نے ایسے مقدمات میں باہمی سمجھوتے کی اجازت نہیں دی جن کے بارے میں جرم کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی ہو۔ ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کی اور اسے تاوان ادا کر دیا۔ آں حضرت صلعم نے تاوان واپس کرنے کے لیے عورت کو حکم دیا اور مرد کو مقررہ سزا دی گئی۔

انھوں نے بیوی کو اجازت دی کہ وہ اپنے خاوند کی جیب میں سے اس کی اجازت کے بغیر اتنی رقم نکال لے جو گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ضروری ہو۔ اُسے چوری تصوّر نہیں کیا گیا۔

انھوں نے فوج داری مقدمات میں پیش ہونے والی سفارشات کی مذمت کی اور فرمایا کہ جو بھی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ سزاؤں میں ذرا نرمی برتنے کی سفارش کرتا ہے، وہ گویا اللہ کی مخالفت کرتا ہے۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک منصف کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ غلطی سے کسی مجرم کو بری کر دے بہ نسبت اس کے کہ وہ غلطی سے کسی کو سزا دے دے۔ یہ فرمان قانون سازی کے جدید اصول کے عین مطابق ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "ایک بے قصور کو سزا دینے کی بہ نسبت نو مجرم اشخاص کو بری کر دینا بہتر ہے۔"

انھوںؐ نے ایک نہایت عمدہ قانونی جملے کے حسب ذیل الفاظ میں ذمّے داری کے اصول کا خلاصہ پیش کیا ہے: "جب غلطی، بھول چوک اور جبر و اکراہ سے کام لیا جائے تو ذمّے داری کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

آں حضرت صلعم نے حاکم یمن کے نام ایک مراسلے میں اس تاوان کا پیمانہ مقرر کیا ہے جو فوج داری مقدمات میں سزا دیتے وقت ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

کسی کو قتل کر دینے کی صورت میں قصاص کے طور پر حسب ذیل عمر کے ایک سو جانور مقرر کیے۔

- ایک سال عمر کی بیس اونٹنیاں،
- دو سال عمر کی بیس اونٹنیاں،
- تین سال عمر کی بیس اونٹنیاں،
- چار سال عمر کی بیس اونٹنیاں،
- ایک سال عمر کے بیس اونٹ،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں کس درجے محتاط رہتے تھے۔ یہ پیمانہ مرتب کرنے کے شاید دو سبب تھے۔ اوّل یہ کہ اگر ایک ہی عمر کے اونٹ مقرر کر دیے جاتے تو ایسے ایک سو اونٹ تلاش کرنا دشوار ہو جاتا اور کوئی عمر مقرر نہ کی جاتی تب بھی جھگڑا رہتا۔ اس صورت میں ایک شخص سب کے سب جوان یا سب کے سب بوڑھے اونٹ پیش کرتا۔ اس پیمانے کے مطابق تمام ایک ہی وقت میں نہ مرتے۔ اس طرح مالک کی تحویل میں چند اونٹ ہمیشہ موجود رہتے۔

دانت توڑنے یا زبان کاٹنے کا تاوان پانچ اونٹ ہے۔ عورت کو قتل کرنے کی صورت میں قصاص اتنا ہی ہے جتنا ایک مرد کو قتل کرنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ انگلی کاٹ دینے کا تاوان دس اونٹ مقرر کیا ہے۔ چوٹ لگنے کی صورت میں جب کہ زخم اتنا گہرا ہو کہ ہڈی دکھائی

دینے لگے تاوان پانچ اونٹ رکھا گیا ہے

جنگ کے قوانین

رسولِ مقبول صلعم نے فوج کے سپہ سالاروں کو تاکید کی تھی کہ کسی بھی ملک کو فتح کر لینے کے بعد ان کے فرائض یہ ہوں گے :

(ا) لوگوں کے ساتھ نرمی برتیں اور انھیں خوش خبری سناتے رہیں۔

(ب) ان کی آسائش کا خیال رکھیں اور ان پر کوئی سختی نہ ہونے دیں، اور

(ج) ایک دوسرے کی فرمانبرداری کریں اور نافرمانی سے اجتناب کریں۔

انھوںؐ نے بین الاقوامی معاہدوں سے انحراف کی مذمت کی۔ دورانِ جنگ میں انھوں نے عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور مذہبی راہنماؤں کو قتل کرنے سے منع کیا۔ انھوں نے پھل والے اور سایے دار درختوں کو کاٹنے اور عبادتِ الٰہی کے لیے مخصوص مقامات کو منہدم کرنے کی ممانعت کی۔ مالِ غنیمت میں سے پیدل فوج کے سپاہیوں کا حصّہ گھڑسوار فوج کے افراد کے مقابلے میں نصف مقرر کیا۔

حکومت اور عدلیہ کے نظام سے متعلّق قوانین

آں حضرت صلعم نے ہر اس شخص کو جو سرکاری عہدے پر تقرری کے لیے کوشاں ہو، اس کے لیے نااہل قرار دیا۔ پسند کا فیصلہ اس امیر کو تفویض کیا جسے عوام کا نمائندہ ہونا ہے۔

اس منصف کو جو جان بوجھ کر غلط اور غیر منصفانہ فیصلہ کرے، "شیطان کا چیلہ" کہا گیا۔ دیانت دار منصفوں کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن وہ خدا تعالیٰ کے دائیں جانب مقام حاصل کریں گے۔

رشوت سے متعلّق ان کا فرمان تھا، رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا، دونوں، جہنّم میں جائیں گے۔

انھوںؐ نے منصفوں کو تاکید کی کہ ایک مقدمے میں پیروی کرنے والے دونوں فریقوں کے ساتھ عدالت میں یکساں برتاؤ کیا جائے۔ انھیں یہ بھی ہدایت کی کہ ان میں سے ہر ایک کا بیان سنے بغیر فیصلہ نہ دیا جائے۔

اسی قاعدے کے مطابق ایک منصف کو اس وقت مقدمے کا فیصلہ دینے سے روکا گیا ہے کہ جب وہ غصّے کی حالت میں ہو۔

شراب کی قیمت، جوئے کے قرضے، کتّے کی قیمت اور ایسی ہی کسی چیز کی وصولی کے لیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے، مسلمانوں کی کسی عدالت میں کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا۔

ایک جانور جو قرضے کی رقم کے عوض کسی کے پاس رکھا گیا ہو، سواری کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کی کفالت قرض دینے والے کے ذمّے ہو، لیکن بصورتِ دیگر اسے استعمال میں نہیں لایا جاسکتا۔

انھوںؐ نے جھوٹی شہادت دینے سے منع کیا ہے۔ قانونِ شہادت میں یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ کسی بدنام شخص کی گواہی نہ لی جائے۔ نیز ان لوگوں کی گواہی نہ لی جائے جو اس فریق سے عداوت رکھتے ہوں جس کے خلاف وہ پیروی کر رہے ہوں۔ کسی مالک کے حق میں اس کے ملازم کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

زکواۃ وصول کرنے والے کو تحائف قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ البتّہ وہ صرف ان لوگوں (دوستوں اور رشتے داروں) سے تحائف قبول کرسکتا ہے جو اسے اس صورت میں بھی، جب کہ وہ اس عہدے پر فائز نہ ہوتا، تحفے پیش کرتے۔

آں حضرتِ صلعم نے صاحبِ اختیار لوگوں کی تابع داری کرنے کی تاکید فرمائی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس تابع داری سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اثر نہ پڑے۔

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔

آپؐ نے فرمایا کہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص پر دوسرے کے بارے میں کچھ ذمّے داری عائد ہوتی ہے اور قیامت کے دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ حساب دینا ہوگا کہ اس نے یہ ذمّے داری کس طور سے پوری کی تھی۔

تمام مقننین کے نزدیک اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں امن و عافیت اور نظم و نسق کی فضا طاری رہے، ہر شخص کو اس امر کی ضمانت دی جا سکے کہ وہ اپنے حق کے مطابق لطف اندوز ہو سکتا ہے اور دوسرے لوگوں کے حقوق اور مراعات سے متعلق خلاف ورزیوں کو روکا جا سکے۔ انھی مقاصد کی تحصیل کی خاطر رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام عمر کوشاں رہے اور انھوںؐ نے ضابطۂ قانون کے بنیادی اصول مرتب کر

دیے۔ اپنے ان احکام کی روشنی میں اصولوں کی مطابقت میں آئین تیار کرنے کا کام انھوںؐ نے بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے اٹھا رکھا، تاکہ وہ ان کے زمانے کے حالات کے لیے مناسب اور ان کی احتیاج پوری کرنے کے لائق ہو۔

بعد کے زمانوں میں مسلمان مقننین نے اپنے وقت کے حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے قوانین بنائے اور اس مقصد کے لیے اجماع، قیاس اور اجتہاد کا لحاظ رکھا۔ لیکن ہر حال میں انھوں نے قرآن اور سنّت کے احکام کو مشعلِ راہ بنایا اور قانون بنانے کے وہ راستے مقرّرہ حدود میں رہتے ہوئے آج بھی ہمارے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔

رسولِ مقبول صلعم کی ولادت سرزمینِ عرب کے شہر مکّہ معظمہ میں ہوئی جہاں ان کو کسی مکتب یا مدرسے میں داخل ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ لیکن کوئی تعلیم نہ ہونے کے باوجود انھوں نے وہ قانونی اصول ہم کو عطا کیے جو کئی لحاظ سے دنیا بھر کے دوسرے ممتاز مقننین کے اصولوں سے سبقت لے گئے ہیں۔ جسٹی نین، آگسٹس اور منو اگر بعد میں پیدا ہوتے تو ایک لمحے کے لیے تذبذب کیے بغیر وہ آں حضورؐ کی فضیلت کا لوہا مان لیتے۔ وہ ان کو ایک ممتاز قانون ساز اور معلّمِ قانون تسلیم کرتے بشرطیکہ آں حضرتؐ کے اقوالِ زرّین ان تک پہنچ جاتے۔ یہ حقیقت کہ ایک انسان جو کرۂ ارض پر کسی استاد کا شاگرد نہ رہا ہو، ایک ممتاز معلّم قانون بن جائے جو یقیناً علم کی ایک دشوار منزل ہے، تو یہ اس کی معجزہ نمائی کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ انؐ کی پیغمبری کے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک مضبوط دلیل بھی ہے۔

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بہ یک نگہ، سبق آموزِ صد مُدرّس شد

(میرا محبوب جو کسی مکتب میں داخل نہ ہوا اور کوئی عبارت نہ لکھی، وہ ایک اشارے میں سینکڑوں استادوں کا معلّم بن گیا)۔

ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ آں حضرتؐ کی قیادت پر فخر کریں اور ان کو من جانب اللہ سمجھتے ہوئے ان کی رسالت پر ناز کریں۔ لیکن محض تسلیم کر لینا کافی نہیں ہے۔

ہم سچے دل کے ساتھ ان کے وفادار نہیں، انؐ کی تابعداری کریں اور اگر ہم انؐ کی سکھائی ہوئی باتوں پر عمل کریں تو وہ نہ صرف انؐ کے لیے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اسلام کے لیے ہماری خدمت گزاری کا ثبوت ہوگا۔ اگر ہم انؐ کی تعلیمات سے اور انؐ کے احکام سے انحراف کریں اور اپنا برتاؤ مخالفانہ رکھیں تو یہ ہماری نافرمانی پر دلالت کرے گا۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ حضورؐ کا اسمِ گرامی ہماری نوکِ زبان پر رہے بلکہ ہمارا رویہ اور طرزِ عمل آں حضرتؐ کی فرمائی ہوئی تلقین کے عین مطابق ہو۔ خدا ہم کو اس مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین

شامِ ہمدرد، پشاور
شنبہ، ۲ مئی ۱۹۷۰ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ حیثیت ایک منتظم

نواب زادہ شیر علی خاں (ہلالِ جُرأت)
وزیرِ اطلاعات و قومی امور، حکومت پاکستان

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ حیثیت ایک منتظم کے موضوع پر تقریر کروں۔ مضمون عمق، طوالت، اور علم چاہتا ہے اور میرے پاس جو مختصر سا وقت ہے میں، اس میں صرف خاص خاص نکات ہی کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ آں حضرتؐ کی شخصیت بہ یک وقت ایک ایسے نابغے کی سی ہے جس کی گرفت زندگی کے ہر شعبے پر ہو۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں ہے جو آپ کی دسترس سے باہر ہو یا جسے آپؐ نے اپنی حیاتِ مبارک اور عمل (سنّت) سے منوّر نہ کیا ہو۔ آپ کی نظر میں زندگی ایک وحدت، ایک اکائی، ایک ہم آہنگی ہے جس میں کسی قسم کی دوئی کا گزر ممکن نہیں ہے۔ تمام عالم، آپؐ کے ارشاد کے مطابق، پرستشِ خداوندی کے لیے مخصوص ہے۔

دوسرے مذہبی پیشواؤں کے برعکس، آپ نے اپنی تعلیمات کو عبادات اور اخلاقیات تک ہی محدود نہ رکھا، بلکہ آپ کی کوشش یہ رہی کہ ایک ایسا مثالی معاشرتی نظام وضع کیا جائے جس میں آزادی کی بنیادیں اخلاقیات، مساوات، اخوّت، انصاف، ہم آہنگی، خدا ترسی، اور باہمی مفاہمت پر تعمیر کی جائیں۔ ایسے نظام کے لیے لازمی تھا کہ ایک ریاستی د

انتظامیہ خاکہ تیار کیا جائے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور سرورِ کائناتؐ نہ صرف ایک اخلاقی و روحانی مصلح ہیں، بلکہ آپ کی دُور رس نگاہیں زندگی کے ہر شعبہ تک پہنچتی ہیں، اور آپ نے خالص دنیاوی مسئلوں کو بھی اپنی روحانیت سے معمور فرمایا ہے۔ میں اس موقعے پر آں حضورؐ کے اُن انتظامیہ کوائف پر مختصر سی بحث کروں گا جو ہمارے ان مسائل سے خاص طور پر تطابق رکھتے ہیں جن سے ہمارا ملک، پاکستان، آج کل دوچار ہے۔

دانش مندی، فہم و ذکا، عزم، ہمت، تدبر، ہمدردی و سخاوت، غیر جانبداری، حلیم الطبعی کے علاوہ ایسی وہ کون سی خصوصیات ہیں جو ایک اعلا منتظم میں ہونی چاہئیں؟ ایک تو یہ کہ اس کو انسانوں کو پرکھنا آتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اپنی اطراف میں وہ لوگوں کو مجتمع کر سکے جن سے، باوجود مختلف مزاج و مختلف النوع خیالات اور پس منظر کے، وہ ان میں وحدان برپا کر دے۔ تیسرے یہ کہ ایسے شخص کے ہمراہی اس کی شخصیت اور اس کے نظامِ فکر و عمل سے اس قدر متاثر و مرتسم ہوں کہ اس سے وفاداری کے سوا اور کوئی متبادل صورت انھیں نظر ہی نہ آتی ہو۔

نرمی سے دعوتِ فکر و عمل

مذکورِ بالا معیارات کے تحت، آں حضورؐ کو ہر صورت میں دنیا کا منتظمِ اعظم قرار دیا جائے گا۔ آپؐ نے اصلاح کے میدانِ ابتلا میں قدمِ مبارک رکھا تو آپؐ کے خاندان والوں ہی نے آپؐ کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ لیکن آپؐ کا وطیرہ ہمیشہ یہ رہا کہ آپؐ نہایت نرمی اور اخلاقی برتری سے بدترین سے بدترین عدو کو مسخر فرما لیتے۔ آپؐ کا طریقہ سختی کا نہ تھا یا یہ نہ تھا کہ ایسے دشمنوں سے علاحدگی اختیار کر لیتے اور فیصلہ کر لیتے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ آپؐ کا یہ صبر بالآخر کام یابی کی انتہائی کشور کشائی کی منازل طے کرتا چلا گیا، اور اس کے نتیجے میں آپؐ کے پاس ایسے گوہرِ ناب دار آئے جس پر دنیا آج بھی عش عش کرتی ہے، مثلاً حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ۔ یہ اور دیگر صحابۂ کرام اسلام کے ستون ثابت ہوئے۔ آپؐ کے ارد گرد خدائے باری کے برگزیدہ ترین بندے جمع ہو گئے، جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، اور حضرت علیؓ جیسے مقدس نام شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی نمایاں انفرادی خصوصیات، اہلیتیں، اور بزرگی

کی نشانیاں موجود تھیں۔ آں حضورؐ نے ان سب حضرات کو ذمّے داریاں سونپیں اور سب نے مل کر ایک مقصد کے لیے ایک گروہ بنا لیا۔ آپؐ نے حتی الامکان ان کی کوششوں کا ساتھ دیا اور ہر گام پر اپنی شفقتِ بے پایاں سے سرفراز فرمایا۔ وہ بھی آپ کے خلوص و محبّت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور انھوں نے بھی اپنی جان اور اپنا مال اور اپنا خون پسینہ آپؐ کی خدمت پر نثار کر دیا۔ آپؐ کا نظم و نسق سختی و بے رحمی پر کسی صورت بھی مبنی نہ تھا، بلکہ اس کی بنیادیں رضا و فرماں برداری پر رکھی گئی تھیں، اور ہر قدم پر آپؐ کے رفقا اور عوام نے ہر ممکن تعاون آپؐ کی خدمتِ گرامی میں بلا کسی توقف کے پیش کیا۔

عبادت

آپؐ کی دور بینی اور دانش و بینش، اور مجتمع کرنے کی بے پایاں صلاحیت کا اندازہ آپ کی قوّتِ نظم و نسق سے ہو سکتا ہے جس کے تحت آپ نے عبادت کے طریقۂ کار کو وضع فرمایا۔ یہ ایک عسکری نظام ہے، کسی قسم کا اٹکل پچّو عمل نہیں۔ جب ایک شخص عبادت کرتا ہے، تو وہ بلاواسطہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں ہوتا ہے، لیکن جماعت میں یہ عمل ایک اجتماعی روحانی تجربہ بن جاتا ہے۔

صرف مسلمان ہی بہ یک وقت خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکتے ہیں۔ ان کا رخ ایک ہی جانب ہوتا ہے، یعنی خانۂ کعبہ کی طرف۔ اس سے ایک ارفع روحانی اور یک جہتی کا اثر قایم ہوتا ہے، جس کو وہ حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے مسجد الحرام میں نماز ادا کی ہے

حج

ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ گو کہ اسلام نے رسومات کو ترک کر دیا ہے، تاہم حضور سرورِ کائنات نے روایات کی اہمیت پر زور دیا ہے اور ایک مدّت مخصوص فرما دی ہے جس میں مسلمان ان رسومات کو ادا کرتے ہیں جو ان کے اسلاف نے کی تھیں۔ حج اس کی مثال ہے۔ اس سے آں حضورؐ کے انتظامی نابغہ کی بے پایاں عظمت کا معترف ہونا پڑتا ہے، چوں کہ ایک ناظم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ استحکام اور ادراکی و ذہنی یک جہتی کو بہ یک وقت عمل میں لایا جائے۔ اس عمل کے بغیر کسی قسم کی انتظامیہ پالیسی یا لائحۂ عمل کی من و عن

تعمیل نہیں ہوسکتی۔

سادگی و قناعت پسندی

آں حضرتؐ کا یہ وطیرہ جو آپؐ نے انتظامیہ پالیسی سے متعلق اختیار فرمایا، اس کو ہم موجودہ اصطلاح میں انسان دوست و مقبول طریقہ کہتے ہیں۔ آپ کا بنیادی مقصد ہر لحاظ سے عوام کی خوش حالی اور روحانی و مالی برتری تھا۔ آپ کا اصرار تھا کہ سادگی و قناعت پسندی کو حکومت اور عوامی زندگی کی تاسیس بنایا جائے۔ آپ نے اپنے وضع کردہ نظام میں کسی قسم کے امتیازی گروہ کو فوقیت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی اور نہ آپ نے دولت جمع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہر دو عوامل کو آپ نے معاشرے کے زیاں پذیر اور سنگین نتائج پر مشتمل تصور فرمایا۔

زہد و تقویٰ

آپ کے وضع کردہ نظام میں کسی فرد کی عظمت و رفعت اس کے زہد و تقویٰ پر منحصر ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ آپ کی دور بین نگاہ نے ضابطۂ حیات نافذ کرتے وقت انسانی کمزوریوں کو حذف نہیں کیا۔ ہر قانون کی ایک حدِ فاصل ہے اور جب ایک کمزوری یا خوبی انتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو معاشرے کے لیے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ انسان ایک حد سے زیادہ تجاوز نہیں کرسکتا۔ اسلام میں حق اور باطل کی دو حدیں ہیں۔ اسلامی معاشرہ اس وقت تک ترقی پسند اور مستحکم رہا جب تک ارتکازِ دولت کی ہوس لوگوں کے دماغوں سے دور رہی، لیکن اس کے حصول یا اس کے حصول کی کوشش نے اُس کی حرکیاتی قوّت کو کمزور سے کمزور تر کر دیا۔

قطعی و غیر مشروط مساوات

آں حضورؐ کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اگرچہ آپؐ کو وحی کی معنوی و عملی حیثیت کی ترجمانی کرنے کا حق بلا شرکت غیرے حاصل تھا، آپؐ نے خود کو ان قوانین سے مستثنیٰ نہ سمجھا، اور آپ ہی سب سے پہلے ان قوانین پر عمل پیرا ہوتے۔ یہ ایک نہایت

نمایاں فرق ہے جو آپ کے طرزِ حکومت اور دوسری حکومتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ایک بدیہی امتیازی صفت اسلام کی یہ ہے کہ اس میں ہر فرد، خواہ وہ آں حضرتؐ ہی کیوں نہ ہوں، قانون کی نگاہ میں اور محصول ادا کرنے میں مساوی ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ آپ نے کئی دیوانی مقدمات میں، جن میں آپ کے عزیز ملوّث تھے، اپنے خلاف فیصلے سنائے اور اس طرح سے بادشاہت کے مقدّس حقوق کو یک قلم نہ تیغ فرما دیا۔ آں حضرتؐ نے اپنی شخصیت کو کبھی حکومت کے قوانین سے مستثنیٰ نہ سمجھا۔

عملی اُخوّت

آں حضورؐ کے نظام کا ایک امتیازی پہلو عملِ اخوت کا اجراء ہے۔ کلامِ پاک میں ارشاد ہے: "تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" مومنوں میں بلا امتیازِ رنگ و نسل، مالک اور غلام، امیر و غریب، عربی اور عجمی، سب کے برابر حقوق ہیں، اور سب کی ذمّے داریاں بھی مشترک ہیں۔ اسلامی اخوّت اس قدر شدّت سے نمودار ہوئی کہ خونی رشتہ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اسلامی اخوّت کی آبیاری کی انتہا اپنے اوجِ کمال پر اس وقت پہنچ گئی کہ جب مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے اخی بن گئے اور ایک ہی سقف کے نیچے بھائیوں کی طرح اسلام کے فروغ میں تن دہی سے کوشش کرنے لگے۔

انصاف اور قانون کی حکومت

آں حضورؐ کے نظام کی درخشندگی ایک مثالی انصاف اور قانون سازی کے ذریعے آج بھی انسانی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے۔ ہر شہری قانون کی نظر میں برابر ہے۔ انصاف قطعاً غیر جانب دار ہوتا تھا۔ کلامِ پاک میں واضح ارشاد موجود ہے (کسی قسم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو یہی بات تقویٰ سے زیادہ نزدیک ہے (مائدہ: ۸)) آں حضورؐ نے اس کی مثال اپنے اس فیصلے سے عطا فرمادی جو آپ نے مکّہ سے ہجرت کرنے والوں کے سلسلے میں صادر فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے مکّہ کے مہاجرین کو سیاسی پناہ دینے سے انکار فرما دیا۔ ایک اور مثال آپ کے انصاف کی اس امر سے فراہم ہوتی ہے کہ عرب کے باوقار قبیلے، بنو مخزوم کے اصرار کے باوجود آپ نے اس قبیلے کی ایک عورت کی سزا منسوخ

کرنے سے انکار فرما دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر آپ کی دختر، حضرت فاطمہؓ بھی ایسے جرم کی مرتکب ہوتیں، تو آپ معاف نہ فرماتے۔

انسانی عظمت

آں حضورؐ کے نظام کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ مدینہ منورہ کا ہر مسلمان، اور نہ صرف مسلمان بلکہ منافق بھی، مکمل طور پر مدینے کے شہری تھے اور گو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو آزاد شہریوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ مسائل حرب و امن بلا کسی توقف و تامل کے زیرِ بحث آتے اور نہایت گرم جوشی اور شدّ و مد سے ہر شخص اظہارِ رائے کرتا یہاں تک کہ آں حضرتؐ فیصلہ صادر فرما دیتے۔ کچھ موقعے ایسے بھی پیش آئے کہ آپ نے دوسروں کی رائے کو ترجیح دی۔ ان بحثوں میں ہر شخص آزادانہ طور پر اظہارِ خیال کرتا اور بسا اوقات آں حضورؐ اپنی رضا سے سرفراز بھی فرما دیتے۔ چناں چہ مساوات اور انسانی عظمت کے اصول اس نظام میں اپنی خالص شکل میں کارفرما تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے نسبتاً کم معروف صحابہ کی رائے کو سراہا، اور اپنے فیصلے کو بدل دیا۔ مثال کے طور پر جنگِ بدر کے سلسلے میں آں حضورؐ نے اپنا سابقہ فیصلہ جو آپ نے مسلم فوج کے پڑاؤ کے متعلّق کیا تھا، حبیب ابن المنذرؓ کی رائے پر بدل دیا۔

جنگِ بدر کی فتح کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ میں جنگی قیدیوں کے متعلّق بحث چھڑ گئی۔ اس بحث سے ان دونوں حضرات کے مزاجوں اور رویّوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آں حضورؐ نے دونوں جلیل القدر حضرات کے دلائل کو بڑے غور سے سنا، اور کافی خاموش غور و خوض کے بعد، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ قیدیوں کو یرغمال کے عوض آزاد کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

جب قریشِ مکہ نے جنگِ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کی غرض سے مدینہ منورہ پر حملہ کیا، تو آں حضورؐ نے ایک مجلس کا انعقاد فرمایا اور استفسار فرمایا کہ مدافعت کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ دو رائیں آپ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ ایک کے مطابق شہر کا دفاع غیر متحرک طریقہ پر اختیار کرنا تھا، لیکن اکثریت کا خیال تھا کہ ایک زیادہ متحرک، اور پُر زور طریقہ اختیار کیا جائے۔ عبداللہ بن اُبی نے جو مدینے کے منافق گروہ کا سردار تھا، پہلے طریقے کے

اختیار کرنے کی رائے دی تھی۔ گو کہ آں حضرتؐ کو ذاتی طور پر اکثریت کی رائے سے اتفاق تھا، تاہم آپ نے عبداللہ بن اُبی، کی رائے سے اتفاق فرمایا اور مدینے سے نکل کر احد کے میدان میں مسلم افواج نے کفارِ مکہ کا مقابلہ کیا۔

شوریٰ

اِن واقعات سے ایک بنیادی اصول کی نشان دہی ہوتی ہے جس کو شوریٰ یا استصوابِ رائے کہا جاتا ہے۔ کلام پاک میں ارشاد ہے:

امرھم شوریٰ بینھم (ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے)

(۴۲:۳۸)

رشوت

صرف ایک صاف ستھرا نظامِ حکومت ہی انصاف اور عدل کا ضامن ہو سکتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں واضح طور پر ارشاد ہے (۲-۱۸۸) کہ رشوت کی پیش کش کے ذریعہ سے انصاف کی سنوائی پر اثر انداز ہونا بدترین گناہ ہے۔ آں حضورؐ کے نزدیک رشوت خور اور رشوت دینے والا دونوں برابر کے مجرم ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ رشوت ستانی ایک بیماری ہے جو معاشرے کو پارہ پارہ کر کے اس کی قوّت کو سلب کر لیتی ہے۔ آپ نے تاریخ کا ایک نہایت اہم سبق دیتے ہوئے فرمایا: "ایک معاشرہ جو رشوت ستانی کا مرتکب ہو، خوف و ہراس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

بیت المال

تاریخ کے اوراق میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے والا عمل بیت المال، (عمومی خزانہ) کا دستور ہے ہر شہری اس میں حصّے دار ہوتا تھا۔ آپ کے انسانیت نواز اصول کے تحت اپاہج، مفلس، لاغر، بے روزگار، بیوہ، اور یتیم کی کفالت بیت المال کے ذریعے ہوتی تھی۔ اس طریقۂ کار پر ارتکازِ دولت،

اجارہ داری، اور دوسری عمرانی کمزوریاں عمل میں آنا ممکن نہ تھیں۔ اس طریق پر زر کی گردش خاص و عام میں رہتی، اور زندگی کی ضروریات کی فراہمی، محنت اور سعی کی ہمت افزائی، برابر کے مواقع کی فراہمی، قانون کی برتری، نسلی و عمرانی امتیاز کے خاتمے، اور اخوت کی فراوانی کی ضمانت ہوتی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس طریقۂ کار سے اخلاقی ذمے داری کی داغ بیل زندگی کے ہر شعبے پر پڑی، خواہ انفرادی، خواہ اجتماعی طور پر۔ آں حضورؐ کے نظام کے یہ اصول تاریخ انسانی کے درخشندہ باب ہیں جو انسان کے لیے ہمیشہ کے لیے شمعِ ہدایت ہیں۔ ہمارا نظامِ حکومت جیسا بھی ہو، اہم بات یہ ہے کہ ہم آں حضرتؐ کے وضع کردہ اصولوں پر کاربند رہیں اور ان سے سبق حاصل کرتے رہیں۔ ہمارے لیے آپ سے بہتر کوئی نمونہ نہیں ہو سکتا۔

اخوّت

آپ نے مختلف قبائل، نسلی گروہوں، اور سرداروں کے درمیان ہم آہنگی کی فضا استوار فرمائی۔ اس فضا کا سرچشمہ ما فوق البشر اخلاقی قوانین اور خدائے تعالیٰ پر ایمان تھا۔ یہ ہم آہنگی تمام دنیاوی قدروں اور منزلوں سے بالاتر تھی۔ انسانیت نے اس سے پہلے کبھی ایسا انقلاب نہ دیکھا، نہ سنا تھا۔ یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ آج ہم تنگ نظری اور مقامی تقاضوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے ہیں اور ہمارے درمیان مختلف النوع "ازموں" نے جنم لے لیا ہے۔ دنیائے اسلام میں آج کل جو کچھ رونما ہو رہا ہے اس کا صرف ایک سبق، اور ایک اٹل سبق ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم پھر سے آں حضورؐ کے اسباقِ مبارک کا احیاء کریں، مقامی اور ذاتی مقاصد کی بندشوں کو منہدم کر دیں، اسلامی اخوّت کو پھر سے زندہ کریں، اور ایک دوسرے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ آں حضورؐ کی سنّت اور آپ کی سیرت ہمارے لیے ازلی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمیں نہ صرف اچھا مسلمان بننا ہے، بلکہ نظم و نسق میں اس طرح حصّہ لینا ہے کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔

ہمیں عالم کون و مکاں کے سب سے عظیم المرتبت مصلح، ناظم، اور خطیب کی مثال اپنی نظر کے سامنے رکھنی ہے۔ آپ کی منتظم کی حیثیت سے عظمت کا اندازہ آپ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے جو آپ اپنی امّت کو برابر دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے (اور یہاں میں کلام

پاک کی آیت کو پیش کرتا ہوں): انا بشرٌ مثلکم (میں بھی تمھاری طرح انسان ہوں)۔ یہ آپ کی بے پایاں عظمت اور رابیت کی دلیل ہے۔ یہی وہ راز ہے جس نے ہر ذہن کو مسخر کر لیا۔ شدید سے شدید بحث کے بعد بھی مومنوں نے آپ کے احکامات کو صحیح تسلیم کر لیا۔ آیئے ہم بھی اس مصلح اعظم کے نقش قدم پر چلیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ کا نظریہ ایک اچھے ناظم اور رہنما کے بارے میں یہ تھا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، اس پر عمل بھی کرتا ہے یا نہیں۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۔ (۶۱:۲)

(مسلمانو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے؟)

شام ہمدرد، راولپنڈی
یک شنبہ، ۵ جولائی ۱۹۷۰ء ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
معلّم و محرّک تعلیم

جناب محمد مسعود صاحب
ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جس قوم میں مبعوث ہوئے اس میں ایک طرف تو تعلیم کا رواج نہ تھا اور چند لوگ ہی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور دوسری طرف اس میں اعلا ذہنی تربیت اور بلند اخلاقی قدروں کا، جس کے نتیجے میں انسانی اعمال کا رخ صحیح سمت کی طرف ہو جاتا ہے، تقریباً فقدان تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تو آپ نے اپنی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ:

انما بعثت معلماً ط "میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں"؛ اور **انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** "میں بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ بہترین اخلاق کی تکمیل کر دوں"۔

آپ کی تعلیم کی نوعیت کیا تھی اس کی قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

لَقَدْ من اللہ علی المومنین اِذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیٰتہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ط (۳: ۱۶۴)

(بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی میں سے رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات

سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے)۔

مندرجہ بالا آیت سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے چار مقاصد واضح ہوتے ہیں جن سے کہ تعلیم و تربیت کے چار درجات متعیّن ہوتے ہیں۔ پہلا اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا یعنی اللہ کا کلام (پیغام) بعینہٖ لوگوں تک پہنچانا۔ دوسرا اس کلام (پیغام) کی تشریح کرنا، جس کی دو صورتیں ہیں! ایک زبانی اور دوسری عملی۔ تیسرا مقصد حکمت کی تعلیم دینا یعنی لوگوں میں یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ اُن کے اعمال صحیح رخ پر یعنی اللہ کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ چوتھا مقصد تزکیہ کرنا یعنی انسانوں کی ذہنی تربیت اِس انداز سے کرنا کہ ان کے جذبات مناسب حدود میں آجائیں جس کے نتیجے میں ان میں اچھی خصلتیں مثلاً سخاوت، ایثار، صداقت وغیرہ پیدا ہو جائیں اور بری خصلتیں مثلاً بخل، کینہ اور حسد وغیرہ دور ہو جائیں۔ مثال کے طور پر شجاعت ایک جذبہ ہے۔ اس کا اظہار اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی بلا وجہ کسی کو چیلنج کرے اور اس سے لڑائی مول لے اور اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ میدانِ جنگ میں حق کے راستے میں دشمنوں سے جنگ کرے۔ موخرّالذّکر صورت میں جذبۂ شجاعت کا اظہار تزکیے کی حدود میں آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تین مرتبے تعلیم کے ہیں اور ایک تعلیم یعنی تزکیے کے لازم کی حیثیت سے ہے کیوں کہ اگر تزکیہ نہ ہو تو علم بجائے مفید ہونے کے انسانوں کے لیے مضر ثابت ہو سکتا ہے۔

آپؐ کے اصولِ تعلیم

آپ کے اصولِ تعلیم بھی تقریباً وہی تھے جو دوسرے انبیاء علیہم السّلام کے تھے۔ ان اصول پر علّامہ شبلی نعمانی رحؒ نے امام رازیؒ اور ابن رشد کے حوالے سے جو روشنی ڈالی ہے وہ مختصر طور پر یہ ہے۔

(ا) انبیاء کا مقصد عوام و خواص دونوں کی تعلیم و تربیت کرنا ہوتا ہے، لیکن چوں کہ عوام کے مقابلے میں خواص کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، اس لیے انبیاء کا لوگوں سے خطاب کرنا اس انداز سے ہوتا ہے کہ وہ کم سے کم فہم و ادراک رکھنے والے کے ذہن میں بھی آسکے۔ البتہ ان کی گفتگو میں ایسے اشارات بھی ہوتے ہیں جو صرف خواص یعنی بلند عقل و شعور کے لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔

(ب) انبیائے کرام لوگوں سے ان کی اس عقل و فہم کے مطابق بات کرتے ہیں جو پیدائشی طور پر اکثر افراد میں پائی جاتی ہے۔ مراقبہ، مجاہدہ وغیرہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ انبیاء کے خطاب کا موضوع نہیں ہوتا۔ چناں چہ انبیاء نے یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ خدا کو تجلیات، مشاہدات، براہین اور قیاسات کے ذریعے پہچانیں۔

(ج) انبیاء کی تعلیم کا مقصد لوگوں کے اخلاق درست کرنا اور ان کے نفس کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے۔ انبیاء اس کائنات میں رونما ہونے والے حادثات، واقعات اور سائنسی مسائل سے بحث نہیں کرتے۔ ان باتوں کو اگر کہیں بیان کرتے ہیں تو وہ بھی خدا کی شان اور قدرت کے ذکر کے سلسلے میں کرتے ہیں مثلاً قرآن کریم میں چاند کی منازل، سورج کی رفتار، آسمانوں اور زمینوں کے طبقات، بارش کے نزول وغیرہ کا جہاں بھی ذکر کیا گیا ہے، وہاں خدا کی قدرت اور عظمت کو ہی بیان کرنے کے لیے کیا ہے۔

ایک دفعہ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے بارے میں پوچھا۔ تو اس بات کا جواب دینے کے بجائے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قل ھی مواقیت للنّاس والحج ط (۲: ۱۸۹)

(آپ کہہ دیجیے کہ یہ لوگوں کے لیے (عام معاملات میں) اور حج کے لیے اوقات متعیّن کرنے کا ذریعہ ہے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ جو علوم مشاہدات اور تجربات سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ براہِ راست انبیاء کی تعلیم کا موضوع نہیں ہوتے۔

(د) انبیاء کی تعلیم کا عام اصول یہ ہے کہ وہ جس قوم کی طرف بھی بھیجے جاتے ہیں اس کے کھانے پینے، لباس، رہائش، عادات اور رسومات یک سر نہیں بدلتے بلکہ پورے معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو بات اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نظر آتی ہے، اس کو بالکل بدل دیتے ہیں، اور جو اس کے حکم کے مطابق ہوتی ہے، اس کو باقی رکھتے ہیں اور جو کچھ خلاف اور کچھ مطابق ہوں ان میں ترمیم و تبدیلی کر کے حکم کے مطابق بنا دیتے ہیں۔

(ہ) انبیاء لوگوں کو اللہ کے احکام کی مصلحتیں نہیں سمجھاتے بلکہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ایسا کرنے سے ناخوش۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مصلحتیں ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتیں، دوسرے لوگوں پر جتنا اس بات کا

اثر ہوتا ہے کہ اللہ اس چیز سے خوش ہوتا ہے اور یہ اجر دیتا ہے اور اس چیز سے ناخوش ہوتا اور یہ سزا دیتا ہے، مصلحتیں سمجھانے کا اتنا اثر نہیں ہوتا۔

(د) انبیاء پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اس کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عقائد، جن کی تعلیم تمام انبیاء یکساں دیتے ہیں، دوسرے وہ احکام جو کہ خاص خاص قوموں اور ملکوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ رسول صلعم چوں کہ تمام قوموں کی طرف اور قیامت کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں، لہٰذا آپؐ کے احکام ان عام اصولوں کے تحت ہیں جو تمام انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں اور جن کی روشنی میں وقت اور جگہ کی ضرورت کے لحاظ سے اجتہاد کر کے ہر پیش آنے والے مسئلے کا حل معلوم کیا جا سکتا ہے۔

آپؐ کی تعلیم کے دو پہلو

رسول صلعم دین کی تعلیم دو طریق پر دیتے تھے۔ ایک اپنے ارشادات کے ذریعے اور دوسرے اپنے عمل کے ذریعے۔ مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ وہ رسول صلعم کی پیروی کریں یعنی اس طریق پر عمل کریں جس طرح وہ اپنے رسولؐ کو کرتے دیکھیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (۳ : ۳۱)

(آپ کہہ دیجیے کہ اگر اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔)

ایک جگہ نماز کے طریقے کے بارے میں رسول صلعم نے فرمایا:

صلوا کما رایتمونی (نماز پڑھو جس طرح تم مجھے دیکھتے ہو)

رسول اللہؐ کی تعلیم کے مختلف طریقے

آپؐ کی تعلیم مختلف طریقوں سے ہوتی تھی۔ عام طور پر آپؐ مجلس میں بیٹھ کر لوگوں سے باتیں کرتے اور اس طرح ان کی تعلیم و تزکیہ ہوتا، کبھی کوئی سائل سوال کرتا تو آپؐ جواب دیتے۔ کبھی مجمع میں تقریر فرماتے، آپؐ کی تقریر چند منٹ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ طویل تقریریں رسول اللہ صلعم سے ثابت نہیں۔ اصحابِ صفّہ کے نام سے

صحابہؓ کی ایک جماعت خصوصیت سے آپؐ کے زیرِ تعلیم رہتی تھی۔ جب آپؐ کوئی بات فرماتے تو اس کو تین بار دھراتے تاکہ لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔

حصولِ علم کی فضیلت و فرضیت

علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا۔ ارشادِ نبویؐ ہے: طلب العلم فریضۃ علیٰ کُلِّ مُسْلِمٍ (علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)

رسول اللہ صلعم کی بہت سی احادیث سے علم کی فضیلت اور حصولِ علم پر اجر مرتب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

ا۔ من جاءہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ وبین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنۃ ط (جس کو ایسی حالت میں موت آگئی کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا تاکہ اس کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنّت میں ایک درجہ کا فرق ہوگا)۔

ب۔ ومن سلک طریقا یلتمس فیہ علما سھل اللہ بہ طریقا الی الجنۃ ط (اور جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے)۔

ج۔ من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتّی یرجع ط (جو شخص علم کی طلب میں نکلتا ہے تو وہ لوٹنے تک اللہ کے راستے میں ہوتا ہے)۔

اشاعتِ علم کی تاکید اور فضیلت

رسول اللہ صلعم نے دینی تعلیمات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی تاکید فرمائی۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

بلغوا عنّی ولو ایۃ ط (میری طرف سے پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہو)۔

کسی اچھائی کی تعلیم دینے والے کا درجہ اس اچھائی کے کرنے والے کے برابر

قرار دیا گیا:

من دلّ علیٰ خیر فله مثل اجر فاعله ط (جس نے کسی اچھی بات کی طرف راہنمائی کی تو اس کے لیے اس کے کرنے والے جیسا اجر ہوگا)۔ کسی کو علم سکھانا جس سے کہ سیکھنے والا نفع حاصل کرے، ان اعمال میں سے قرار دیا گیا جو انسان کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الّا من ثلثه الّا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله ط (جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے اسی کا عمل منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین کے (کہ وہ منقطع نہیں ہوتے) صدقۂ جاریہ، وہ علم جس سے کہ نفع حاصل کیا جائے، نیک بیٹا جو اس کے لیے دعا کرے)۔

مسلسل حصولِ علم کی ترغیب

قرآنِ کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس دعا کی تلقین کی گئی: ربِّ زدنی علما۔ (اے میرے رب میرے علم میں زیادتی فرما) اس ہدایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حصولِ علم میں تسلسل مطلوب ہے۔ کسی بھی مقام پر قناعت کرنا مطلوب نہیں۔ اس کے علاوہ علم کے کسی مرتبے پر پہنچ کر اس کو آخری حد سمجھ لینا مناسب نہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے: وفوق کل ذی علم علیم (اور ہر علم والے سے بڑھ کر ایک علم والا ہے)۔

فروغِ علم کے لیے رسول اللہ کا اہتمام

غزوۂ بدر میں قریش کے بعض لوگ قیدی بن کر آئے۔ ان کے متعلقین ان کی رہائی کے لیے مالی فدیہ لے کر آئے۔ اگرچہ اس وقت مسلمانوں کو سخت مالی مشکلات کا سامنا تھا پھر بھی رسول اللہؐ نے مالی فدیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فدیہ کے طور پر ہر قیدی کے ذمّے یہ لگایا کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ فروغِ علم

کے لیے رسول اللہ صلعم کا یہ ایسا انوکھا اقدام تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

حصولِ علم کے لیے دوسرے اسلامی محرکات

قرآن کریم اور احادیثِ نبوی میں براہ راست ہدایات کے علاوہ حصولِ علم کے لیے جس میں طبعی (سائنسی) علوم بھی شامل ہیں، اور محرکات بھی ہیں، ان میں سے ایک متحرک مسلمانوں کے لیے یہ ہدایت ہے کہ وہ دنیا میں سیر و سیاحت کر کے ان قوموں کے انجام سے، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو جھٹلایا تھا، عبرت حاصل کریں۔ ایک محرک مسلمانوں کے لیے یہ حکم ہے کہ اپنے دشمنوں اور اللہ کے دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے جتنی زیادہ قوّت اور سامانِ جنگ تیار کر سکیں کریں۔ یہ حکم جنگی صنعتوں اور ان سے متعلقہ سائنسی علوم کے حصول کے لیے ایک اہم محرک ہے۔

آیاتِ قرآنی میں کائنات میں مظاہرِ قدرت کے بار بار حوالے مثلاً چاند کی مختلف منزلوں کا ذکر، ہر چیز کو ایک خاص نسبت سے پیدا کرنے کا بیان، سورج اور چاند کے خاص خاص دائروں میں حرکت کرنے کا ذکر، ہر چیز کے جوڑا جوڑا پیدا کرنے کا بیان۔ یہ سب چیزیں سائنسی تحقیقات کے لیے محرکات کا کام دیتی ہیں۔ نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ کے احکام بھی سائنسی مطالعے کے محرکات کا کام دیتے ہیں۔ نماز کے اوقات معلوم کرنے اور نماز کے لیے سمتِ قبلہ کے تعیّن کے لیے مسلمانوں کو سورج اور ستاروں کا ارتفاع اور ان تمام مقامات کے، جہاں پر کہ مسلمان آباد ہوں، طول بلد عرض بلد معلوم کرنے پڑتے ہیں۔ خبر، خراج، عشر اور غنیمت کے سلسلے میں رسول اللہؐ کی ہدایات بھی ایک علمی محرک ثابت ہوئیں ان مدوں سے جو آمدنی ہوتی تھی اس کے حساب کتاب کے لیے ریاضی کا علم حاصل کرنا ضروری تھا۔

ورثے کی تقسیم بھی، جس کے متعلّق قرآن کریم نے واضح احکام دیے ہیں علم الحساب کے لیے ایک محرک ثابت ہوئی اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق ورثاء میں ان کے حصول کی تقسیم کے لیے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ طبی معاملات کے بارے میں رسول اللہ صلعم کے ارشادات مثلاً یہ کہ ہر اس بیماری کے لیے جس میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو

مبتلا کرتا ہے، اس نے ایک مناسب علاج پیدا کیا ہے، مسلمانوں کی طبی تحقیقات کا ایک ذریعہ ثابت ہوئے۔ انسانوں کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کے لیے اسلامی ہدایات نے مسلمان حکمرانوں اور عام لوگوں کی توجہ ادویات کی تیاری، حفظانِ صحت کی ترقی اور نئے ہسپتالوں کے قیام کی طرف مبذول کرائی۔

علما کا مقام

حدیثِ نبویؐ میں علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جب اللہ کسی کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو دین کی فہم عطا فرما دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات بھی علماء کے بلند مقام پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ا ۔ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرًا (۲: ۲۶۹)

(جس کو حکمت دی گئی اس کو خیرِ کثیر دی گئی)۔

(ب) انّما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ ط (۳۵: ۲۸)

(اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علما ہی پر خشیت طاری ہوتی ہے)

قرآنِ کریم نے اہلِ علم کو علم نہ رکھنے والوں کے مساوی قرار نہیں دیا۔ اس سے علماء کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ط (۳۹: ۹)

(آپ کہہ دیجیے کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے برابر ہیں)۔

علما کو عبادت گزار لوگوں پر بھی فضیلت دی گئی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

فضل العالم علی العابد، کفضلی علیٰ ادناکم۔

(عابد پر عالم کی فضیلت، ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے سب سے ادنیٰ پر)۔

رسول اللہ صلعم کی تعلیمات کے نتیجے میں نئے نئے علوم کی بنیاد پڑی۔ مثلاً فقہ اور اصولِ فقہ، عربی زبان کی گرامر وغیرہ۔ رسول اللہ صلعم کے اس ارشاد نے

"من کذب علیّ متعمّدًا فلیتبوأ مقعدہ من النّار"

(جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔)

مسلمانوں کو محتاط کر دیا کہ رسول اللہ صلعم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لیے علم الرجال وجود میں آیا تاکہ کسی روایت پر یقین کرنے سے پہلے راوی کو یا کسی خبر کو ماننے سے پہلے مخبر کو پرکھ لیا جائے۔ اس اصولِ نقد و تحقیق سے بے سروپا داستانوں کا اصل تاریخی واقعات سے جدا کرنا آسان ہو گیا اور اس طرح علم تاریخ کو ایک ٹھوس اور مستند شکل حاصل ہو گئی۔

اس طرح مشاہدہ کائنات کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایات نے مسلمانوں کو مشاہدات، (یا تجربات جو دراصل مشاہدات ہی ہیں، جو مخصوص حالات میں کیے جاتے ہیں) کی طرف متوجہ کیا اور آگے چل کر مشاہدات و تجربات ہی سائنسی تحقیقات کی بنیاد قرار پائے۔ ان مشاہدات و تجربات کے لیے نئے سائنسی اسلوب (SCIETIFIC METHODS) ایجاد ہوئے۔ یہ وہ انقلابی اقدام ہے جس کی بدولت صحیح معنی میں سائنسی علم وجود میں آیا۔

رسول اللہ صلعم کی ہدایات و تعلیمات کی بدولت مسلمانوں میں ایک وسیع علمی تحریک پیدا ہو گئی، جس کا تفصیل سے ذکر مسلم مورخین نے کیا ہے اور غیر مسلم محققین بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انگلستان کے ایک محقق رابرٹ بریفالٹ لکھتے ہیں کہ اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی اور نہ اب تک ہے کہ کسی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں حکمران طبقے اتنے بڑے پیمانے پر حصولِ علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہو گئے ہوں، خلفاء امرا اپنے محلوں سے اٹھ کر کتب خانوں اور رصدگاہوں میں جا گھستے تھے۔ اہلِ علم کے خطبات کو سنتے اور ان سے مسائل ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ مسودات و مخلوطات، اور نباتاتی نمونوں سے لدے ہوئے کاروان بخارا سے دجلہ تک رواں دواں رہتے۔ کتابوں اور معلّموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے۔ کسی سلطنت سے تاوانِ جنگ وصول کرنے کے سلسلہ میں یونانی مصنّفین یا کسی ممتاز ریاضی کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔ وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام، مدارس کے لیے اوقاف کے انتظام اور غریب طلبہ کے لیے وظائف کے اہتمام میں اپنے آقاؤں سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتے تھے۔ اہلِ علم کو بلا امتیازِ نسل و مذہب دوسرے سب لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ان پر دولت

وثروت اور اعزازات کی بارش کر دی جاتی تھی۔ وہ ولایات کے حاکم تک مقرر کر دیے جاتے۔ جب خلفا کسی سفر یا مہم پر روانہ ہوتے تو اہلِ علم کا ایک گروہ اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار ہمراہ ہوتی تھی۔

یہ علمی تحریک بارھویں صدی میں زیادہ تر مسلم اسپین کے ذریعے یورپ میں، جہاں کہ لکھنا پڑھنا خانقاہوں تک محدود تھا اور جہاں تعلیم کے بارے میں گریگوری پادری جیسے شخص کا یہ خیال تھا کہ جہالت پارسائی کی بنیاد ہے، پھیلنا شروع ہوئی اور یہی علمی تحریک سولھویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کا سبب بنی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشرق و مغرب میں علم کی روشنی پھیلنے میں رسول اللہ صلعم کی تعلیمات کا کتنا عظیم حصہ ہے۔

افسوس کہ علم کی روشنی کو دنیا تک پہنچانے والی مسلمان قوم آج عام طور پر علم سے محروم ہے اور اپنے دین اور تاریخ اور دوسرے علوم سے ناواقفیت کی وجہ سے دنیا کی بہت سی قوموں کے مقابلے میں پس ماندہ ہے۔

ضرورت ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلعم کی تعلیمات کی روشنی میں آج مسلمان پھر سے علم ہدایت کی شمع روشن کریں اور دنیا کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
یک شنبہ، ۵ رمئی ۱۹۷۰ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
عسکری رہنما

جناب بریگیڈیر گلزار احمد (ریٹائرڈ)

خدائے تعالیٰ کے آخری نبیؐ، کہ آپؐ انسان کامل اور ہر پہلو سے تمام بنی نوعِ انسان کے لیے مثال تھے اور میدانِ غزوات میں بھی اسی طرح ایک مثالی لیڈر یا رہنما تھے، جس طرح کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ آپؐ کے اعمال جو غزوات کے دوران درخشندہ اور آب و تاب کے حامل رہے آج بھی انسان کو ان پر گامزن ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ آج بھی فوجی (عسکری) تحریک کے رہنما آپؐ کے اعمال سے مستفید ہو کر کامیابی کی کلید حاصل کر سکتے ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۳۳: ۲۱) (تمھارے لیے خدا کے پیغمبر میں بہترین نمونہ ہے)

یہ ارشاد صرف زندگی کے ایک شعبہ سے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ اس کے تمام شعبوں پر مطلق ہے، خواہ وہ شعبہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُمّت کے اجتماعی پہلو پر اس کا اطلاق زیادہ ہے چوں کہ اگر اجتماعی پہلو میں غلط بینی سے کام لیا گیا، تو اس کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے ٭ کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

جدل، خواہ وہ نفسِ انسانی پر کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے، ناگزیر ہے اور کوئی قوم یا ملت اگر جنگ کو ثانوی حیثیت دیتی ہے، تو یا تو وہ قطعاً معدوم ہو جاتی ہے، یا اپنی انفرادی اور آزادانہ حیثیت کھو دیتی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو متنبہ فرمایا ہے:

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم ولا تضروہ شیئا (۹:۳۹)
(اگر تم جنگ کے میدان میں دو بدو مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو، تو تمھیں سخت سزا ملے گی اور تمھاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ اور اس قوم کو تم کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے

یہ موقع مثالیں دے کر سمجھانے کا نہیں ہے۔ بہر کیف اتنا اشارتاً عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صدہا مواقع ایسے گزرے ہیں جب امّت جنگ کے میدان کی صعوبتیں اٹھانے کو تیار نہ ہوئی۔ اور آں حضورؐ کی مثال سے انحراف کر گئی۔ نتیجہ وہی رہا جو ہونا چاہیے تھا۔ فطرت امّت سے اغماض نہ کر سکی اور مسلمانوں کے اپنے گھروں پر جہاں وہ صدیوں سے آباد تھے، غیروں نے قبضہ کر لیا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے جنگ کا محاسبہ خاص و عوام دونوں سے نہایت سخت ہے اور جب تک انسان اپنی کمزوریوں کا مداوا نہ کرے گا اور اس کی ضعیف جبلّت اس پر حاوی رہے گی، جنگ کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ آں حضورؐ نے جو مثال جنگ کی رکھی ہے وہ انسانی حقوق اور قانونِ خداوندی کی برتری کے واسطے ہے۔ قرآنِ شریف میں ہے کہ خدائے تعالیٰ کائنات پر مہربان ہے)۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین۔ (۲:۲۵۱) اگر اللہ جہاد کے ذریعے انسانوں کو دوسرے انسانوں سے محفوظ نہ رکھتا، تو دنیا میں بدی کا غلبہ ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کائنات پر مہربان ہے)۔

بہادر افراد اپنی قربانیوں سے نحیف افراد کو محفوظ رکھتے ہیں، اور ثانی الذکر کے جان و مال کی نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر حفاظت برقرار رہتی ہے۔ چناں چہ یہ ایک فطری امر تھا کہ خدا کے آخری پیغمبر ذی جاہ انسانیت کو عملاً اور ابدی طور پر عالمانہ انداز میں دکھلا دیتے کہ ایک قوم جس نے نیکی کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے کس طرح نبرد آزمائی میں جری سے جری دشمن سے مقابلہ کرنے میں نہیں چوکتی۔ یہ آپؐ کے صالح عمل کی ایک مثال ہے اور

آپ کی صداقت پر شاہد ہے۔ آپ نے جنگ کی جو مثال دنیا کے سامنے پیش کی ہے جو اس قدر تابندہ و درخشندہ ہے کہ جو حضرات آپ کی دعوت سے متفق نہیں ہیں، وہ بھی ایک حد تک آپ کی مثال کو اپنائے ہوئے ہیں۔

"جنگ آمد" کے اصول کی نشان دہی کے خدوخال آں حضورؐ کی قیادت میں نہایت نمایاں اور ممیّز نظر آتے ہیں۔ یہ آپ کی ہمہ جدل TOTALWAR کے وضع کردہ اصول اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کا ننھا منّا پودا ابالبدگی اور ترقی کی منازل طے کرتا ہوا ایک طویل قامت درخت بن گیا اور اسلام زندہ جاوید رہا۔ آج بجنگ آمد اور ہمہ جنگ کے اصول دنیا بھر میں تسلیم کیے جا چکے ہیں لیکن ان اصولوں کی تاسیس حضورؐ صلعم نے رکھی ہے۔ اگر انسان صداقت کی زندگی بسر کرنے سے قاصر ہے اور جنگ کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں ہے، تو جنگ سے مفر نہیں ہے اور اس سے مفر کی صورت میں زندگی بے سود ہے۔ اگر غزوۂ بدر سے گزر کر دیگر غزوات کا جو لبعد میں پیش آئے جائزہ لیتے ہیں (جن کو قریش اور دیگر قبیلوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کی غرض سے جنم دیا) تو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے امّت کے سپرد کر دیے تاکہ جنگ میں کسی قسم کی پس اندازی کا جواز نہ رہے۔ آں حضورؐ نے ان احکام پر عمل فرمایا جن کا قرآن شریف میں یوں ذکر ہے: خذوا حذرکم (اپنی مدافعت کے لیے خبردار رہو) اور قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (اللہ کے نام پر ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں) آپ نے اس حکم پر بھی عمل فرمایا: واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل (۸ : ۶۰) (اور کفّار سے حتی الوسع مقابلہ کرنے کی کوشش کرو، اپنی تمام قوت اور تمام گھوڑوں سے)۔

ایسی تیّاری جس میں سپاہ کی تمام اخلاقی اور عسکری صلاحیتیں اس قدر ہم آہنگ ہو جائیں کہ وہ سخت سے سخت ابتلاء و آزمائش کے لیے تیار ہو جائیں، ایک قائد کی اوّلین ذمّے داری ہوتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے، تو آں حضورؐ کے احکام کے مطابق عسکری قائدین کو دیکھنا چاہیے کہ ان کے سکھائے ہوئے اسلام کے سپاہی آئندہ بھی ایسی فوج کو جنم دیں گے جو اسلام کے نام پر کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب امّت کے عسکری قائد آں حضرتؐ کے نقشِ قدم پر گامزن رہتے ہیں آپ

اسلام کے سب سے پہلے اور سب سے عظیم عسکری دفوجی قائد تھے۔ اسلام کی سپاہ کو جنگ کے لئے تیار کرنا چاہیے اور امن کا حصول اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ قرآن کے مطابق: ترهبون به عدو الله وعدوكم (وہ اس کے نام سے کانپنے لگیں، خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن) وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم۔ (۸: ۶۰) (اور ان کے علاوہ دوسرے بھی جن کو تم نہیں لیکن اللہ جانتا ہے)

حضور صلعم نے اپنے اطراف واکناف سے اس قدر کم وسائل، انسانی ومالی، حاصل کیے تھے کہ اس حصول کے امکانات بادی النظر میں صفر کے برابر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن غزوۂ بدر اور بالآخر غزوۂ خندق کے بعد اسلامی امّت نہ صرف ایک موثر مدافعتی قوّت بن گئی، بلکہ اس کے اثرات اس قدر دور رس ثابت ہوئے کہ بڑے بڑے قبیلے جن کے مالی اور انسانی وسائل امّت کے وسائل سے ہر طرح زیادہ تھے، اس سے خوف زدہ ہو گئے۔ ایسا بھلا کیسے ممکن ہو سکتا تھا ماسوا اس کے کہ امت کے عسکری قائدؐ نے اپنی امّت کو تربیت عطا نہ فرمائی ہوتی۔

جنگ کی تیاری کسی قسم کے مالی وسائل کے بغیر ناممکن ہوتی ہے۔ لیکن آں حضورؐ نے امّت کو جو روحانی اور اخلاقی تربیت عطا فرمائی تھی، وہ ایسی تھی کہ جیسے ہی جنگ کے لیے وسائل کی طلبی ہوئی، امّت نے جہاد کے لیے دل کھول کر عطیات دیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی ملکیت کا آدھا حصّہ جنگ کے لیے وقف کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے جو ان پہلے افراد میں سے تھے جنھوں نے جہاد کی راہ میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، اپنی تمام ملکیت کو آں حضورؐ کے قدموں پر نچھاور فرما دیا۔

جنگ کا عمل ایک بڑی حد تک عسکری قائد کے نصب العین پر موقوف ہُوا کرتا ہے۔ یہ باور کرانا ضروری ہُوا کرتا ہے کہ جنگ کیوں اور کس مقصد سے لڑی جا رہی ہے اور اس مقصد کو عام سپاہی تک موثر طریقے سے پہنچانا ہوتا ہے، تاکہ تربیت اور جنگ دونوں کے دوران میں وہ صحیح معنوں میں جنگ کے مفہوم سے واقف ہوں اور اس میں حصّے دار ہوں، نہ کہ کٹھ پتلی کی طرح صرف حکم کی تابعداری بجا لاتے ہوں۔ آں حضورؐ کا پہلا مقصد نہتّی منّی اسلامی حکومت کی جو مدینہ اور دیہی علاقوں تک محدود تھی حفاظت کرنا تھا: تاکہ آپ اپنے پیغام کو محفوظ فرما سکیں۔ آپ کا مقصد (نعوذ باللہ) کسی قسم کا استعمار نہ تھا کہ آپ

دوسرے علاقوں پر زبردستی قبضہ کرلیں۔

آں حضرتؐ نے مدینہ منوّرہ پہنچتے ہی امّت کی عسکری تربیت شروع فرمادی۔ آپ نے تربیتی اور ہراول دستے باہر بھیجے جن کو مغربی تاریخ دانوں نے (نعوذ باللہ) مکّہ کے کاروانوں کی لُٹائی سے غلط طور پر منسوب کیا ہے۔ حضرت حمزہؓ، حضرت عبیدہ بن حارثؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس ضمن میں مشہور ہیں۔ کچھ کا مقصد قریبی قبائل سے دوستی کرنے کا تھا۔ علاوہ بریں یہ بھی لازم تھا کہ فوجیوں اور عسکری قائدین کو غیر مالوس علاقوں سے گزر کر ان سے واقفیت حاصل ہو جائے اور یہ سفر ایک ضابطے کے تحت عمل میں آئے۔ بنو مدلج سے دوستی اسی عسکری تربیت کے تحت ہوئی، اور ابتدائی تربیت کی کامیابی کا راز ایک بڑی حد تک اسی تربیت کا مرہونِ منّت ہے۔ یہ تربیتی تجربے نومینز لینڈ NO MANS LAND میں ہوئے لیکن یہ علاقے ایسے تھے جہاں کسی وقت بھی قریش سے جنگ ہو سکتی تھی۔ یاد رہے کہ ماسوا اس کے کہ اسلامی افواج کو مدینہ کے اطراف و اکناف کے علاقوں سے واقف کروایا جائے، یہ بھی لازم تھا کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان خوش گوار تعلقات پیدا ہو جائیں، اور یہ تعلّقات جنگ کے ماحول میں بہتر طور پر پروان چڑھ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں مدینہ کی نئی حکومت کو یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ اس حکومت کے پاس ایسے ذرائع تھے جن کے ذریعے عسکری و تربیتی سفر ان علاقوں میں عمل میں لائے جا سکتے تھے جن کو ابھی تک مکّہ کے کاروانوں کی ملکیت تسلیم کیا جاتا تھا اور اس امر کو مدینہ کے دیہی علاقوں کے قبائل پر باور کروانا ضروری تھا۔ یہ امر اس لیے اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا تھا کیوں کہ مکّہ کے مخبر اسلام کے خلاف بدترین قسم کی زہریلی افواہیں پھیلا رہے تھے، اور یہ افواہیں مدینہ منوّرہ تک میں گشت کرنے لگی تھیں۔ چناں چہ یہ عسکری دریافت کرنے والے تجربات کئی ایک نقطۂ نظر سے نہایت اہم تھے۔ تربیت، فوجی اور جغرافیائی دریافت، دشمنوں کے پراپیگنڈا کی تردید، سپاہ اور عوام کی حوصلہ افزائی، اور قریبی قبائل سے تعلّقات کی استواری۔ ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ یہ ہراول دستے غزواتِ صغیرہ تھے، چوں کہ اگر ان کا مقصد مکّہ کے کاروانوں کی تاراجی اور لوٹ مار سے ہوتا، تو آں حضورؐ اپنے فوجی لیڈروں کو ہر گز یہ حکم نہ عطا فرماتے کہ وہ جنگ سے بہر صورت اجتناب کریں۔ عبداللہ بن جحش رضؓ کی مثال اس امر کی صداقت کو ثابت کرتی ہے؛ آں حضورؐ نے ایسے دو مکیّوں کے قتل پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس قبیلے کو جس سے یہ

دو افراد متعلق تھے، خوں بہا دلوایا۔

ایک غیر معمولی فوجی قائد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی افواج کو اسی قسم کی تربیت دیتا ہے اور ان کو اس طرح آراستہ کرتا ہے کہ وہ اس کی افواج سے زیادہ تعداد کی افواج کو شکستِ فاش دے سکتی ہے۔ آں حضرتؐ نے غزوۂ بدر کے دوران صرف ۳۰۰ فوجیوں پر مشتمل مختصر سی فوج کے ذریعے کفار کی بھاری فوج کو شکست دی، جس سے آپ کی قیادت کی ہر لحاظ سے برتری ثابت ہوتی ہے۔ آپؐ نے ثابت کر دیا کہ آپ زیادہ طاقتور، زیادہ مسلح، اور جری سپاہ پر مشتمل فوج کو شکست دے سکتے تھے۔ چناں چہ آپؐ نے جو طریقۂ کار غزوۂ احد میں اختیار فرمایا، جب کہ دشمن کے پاس شہسواروں CAVALRY پر مشتمل فوج بھی تھی، جو دونوں اطراف FLANKS ڈھانکے ہوئے تھی، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی دوربیں نگاہیں معمولی سے معمولی تفصیلات تک رسائی رکھتی تھیں اور جو تصویر آپ کی نظروں کے سامنے آتی وہ مکمل اور جامع ہوتی۔ بعینہٖ غزوۂ خندق میں آپؐ نے اپنی بے مثال شجاعت اور قیادت کی مثال دکھائی اور ایک زیادہ طاقتور دشمن کے محاصرے کو پسپا کر دیا۔ بدر، اور احد کے برعکس غزوۂ خندق میں آپؐ نے عملی طور پر ظاہر فرمایا کہ مدافعتی جنگ کیسے لڑی جاتی ہے جب کہ دشمن امّتِ اسلامیہ کی تاراجی و تباہی کا مصمّم ارادہ کر چکا تھا۔ جنگِ حنین میں قریبی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی اور کفّار کے پاس ایک لاکھ کے قریب فوج تھی، جو جدید ہتھیاروں اور آتشیں سامان سے لیس تھی۔ آپؐ نے جس طریق پر دشمنوں سے حنین اور مکّہ کی فتح کے بعد فراخ دلی کا رویّہ رکھا وہ مثالی ہے اور ہمارے لیے بیش بہا سبق ہے۔ یہ طریقہ ہے جس سے ایک ہارے ہوئے دشمن کو گرویدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے جو پے در پے فتوحات حاصل کیں وہ ان ہی اصولوں پر مبنی تھیں جو آں حضرتؐ نے وضع فرما دیے تھے۔

ایک عسکری قائد کو شجیع، صابر، صاحب استقامت، نڈر اور اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند ہونا چاہیے۔ یہ تمام خصوصیات آں حضورؐ نے اپنی حیاتِ مبارک کے دوران دنیا کو دکھا دیں۔ اور خصوصاً اس وقت اور زیادہ نمایاں طور پر جب آپؐ مسلم افواج کی قیادت فرما رہے تھے۔ آپ کا پائے استقامت غزوۂ بدر میں قائم رہا اور غزوۂ احد میں بھی اس کو جنبش نہ ہوئی، گو کہ یہ ایک سنگین موقع تھا جب کہ یقینی فتح تقریباً شکست میں تبدیل ہو

گئی تھی، اور آپؐ کے جسم مبارک پر زخم بھی آئے تھے۔ غزوۂ خندق کے نازک مرحلے پر آپؐ نے ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی اور جس رحم اور فراخ دلی سے آپؐ نے مکّہ کے شکست خوردہ افراد کو نوازا، وہ ایسی مثال ہے جس کو نہ دنیا کبھی پہلے دکھا سکی نہ بعد میں پیش کر سکے گی۔

ہم پہلے بھی اس اہم امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ کسی قوم کے قائد کو اپنے نصب العین کو صحیح معنوں میں تعیّن کر لینا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگِ بدر کی فتح کے بعد، غزوۂ احد کی قریبی شکست اور بعد ازاں فتح کے بعد، خندق کی جنگ اور دشمن کی کام یاب پسپائی کے بعد، خیبر اور اس کے آس پاس علاقوں کے کام یاب محاصروں کے بعد، اور مکّہ کی بلا خون خرابہ کی فتح کے بعد کے لمحات اس نصب العین کی تائید کرتے ہیں جس کی نشان دہی کلام پاک میں کی گئی ہے:

"آپؐ کی قوم ان قوموں سے برتر ہے جو ابھی تک دنیا میں بھیجی گئی ہیں۔ آپ سچ کو رائج اور باطل کو منع کیجیے۔" (سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ کا مفہوم)

امّتِ مسلمہ کی تشکیل کا مقصد اس وقت تک پورا نہ ہوتا جب تک کہ امّت کے پاس اتنی قوّت نہ ہوتی کہ وہ دوسری اقوام کو باطل سے روکنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی۔ امّت کی پہلی پشت کے پہلے فوجی قائدؐ نے اس امّت کو اتنی قوت بخش دی کہ وہ اپنی مدافعت کر سکے اور اس کو بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر طریقے پر عمل میں لا سکے۔ آپؐ نے ایک ایسی زندہ مثال چھوڑی ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر امّت باطل کو مسخر کر سکتی ہے۔

ان اعداد و شمار کا مختصر سا جائزہ، جو غزواتِ نبویؐ سے متعلق ہیں، ہمیں آپ کی عسکری فراست کی صحیح تصویر دیتے ہیں۔ آپؐ سے زیادہ غزوات میں کسی نے حصّہ نہیں لیا اور کسی نے اپنی زندگی کو خطرے میں اس قدر اور اتنی مرتبہ نہیں ڈالا۔ صحابۂؓ کرام کے ہمراہ آپؐ نے ہر صعوبت کو لبیک کہا۔ آپؐ نے خندقیں اپنے مبارک ہاتھوں سے کھودیں۔ آپؐ نے چٹانوں کو کاٹا، آپؐ نے ہر قسم کی تکلیف اور صعوبت محاصرۂ مدینہ کے دوران سہی۔ رحمتہ للعالمینؐ نے اس قدر رحم اور منصف مزاجی کا ثبوت دیا ہے کہ آج تک کوئی عسکری قائد آپؐ کا مقابلہ کرنے کا منہ نہیں رکھتا۔ مدینہ کی حکومت ۲۷۴ مربع میل یومیہ کے حساب سے بڑھتی رہی اور دس برس میں اتنی بڑھ گئی کہ اس کا رقبہ یورپ غیر از شمولیتِ روس کے برابر ہو گیا لیکن اس دوران صرف ۱۲۰ مسلمان جامِ شہادت سے بارباب ہوتے۔

غور کرنے پر اندازہ ہوگا کہ سرکارِ دوعالم صلعم نے جو اصولِ حرب اختیار فرمائے وہ احکامِ قرآنی پر مبنی تھے۔ چناں چہ یہ اصول ہمارے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور نہ صرف احکامِ خداوندی ہیں بلکہ سُنت بھی ان پر شاہد ہے۔ پہلا اصول مدافعت کا ہے، جس میں امت کی مدافعت، اس کی افواج، اس کے سامانِ حرب، اس کی دولت، اور عسکری اطلاعات کی فراہمی کی مدافعت بھی شامل ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

یا ایّھا الّذین اٰمنوا خذوا حذرکم (۴:۷۱) (اے ایمان والو، اپنے بچاؤ کا انتظام کرو)

میرے خیال میں یہاں مراد قومی دفاع اور افواج کے مختلف عناصر کی مدافعت ہے۔

سامانِ حرب اور فوجی اور عوامی تنصیبات کی مدافعت کی نشان دہی مندرجہ ذیل آیت میں کی گئی ہے: "ودّ الّذین کفروا لو تغفلون عن اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون علیکم میلۃً واحدۃ" (۴:۱۰۲)

(کافر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہوجاؤ تو تم پر ایک بارگی حملہ کر بیٹھیں)

کفّار کے ناگہانی حملے کا بیان وضاحت طلب نہیں ہے۔ آں حضورؐ ہمہ وقت دشمن کے ناگہانی حملے کی طرف سے باخبر تھے۔ ایسی مثال نہیں پائی جاتی جب کہ آپؐ نے مدینہ میں اپنی غیر موجودگی کی صورت میں کسی قائد کو اپنی جگہ مقرر نہیں فرمایا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپؐ نے ریاست اور مدنی حفاظت کے لیے کس قدر موثر اقدام فراہم فرما رکھے تھے۔

قرآن پاک میں سیاسی و فوجی اطلاعات کی اہمیت کے متعلق احکامات موجود ہیں: یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتّخذوا بطانۃ من دونکم۔ (۳:۱۱۸) اے مومنو، اپنے دلوں کے راز اپنوں کے علاوہ دوسروں پر افشا نہ کرو) اور

وفیکم سمّٰعون لھم۔ (۹:۴۷) (اور تمہارے درمیان ان کے مخبر ہیں)

ایک مختصر سے مضمون کے لیے یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ آں حضورؐ کے وضع کردہ تمام اصولِ حرب کی نشان دہی کی جاتی اور ان احکامات سے اس کی توجیہہ کی جائے جن کا نزول براہ راست خدائے تعالیٰ سے آں حضورؐ پر ہوا۔ بہر حال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جیسا کہ آپ کے دیگر اعمال سے ظاہر ہے آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو غزوات کے دوران بھی جامۂ عملی

سے سرفراز فرمایا۔ اگر جہاد اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق لڑا جاتا ہے، تو ان قوموں اور افراد کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو اپنے سے نحیف قوموں اور افراد کو جور و ستم کا نشانہ بناتی ہیں۔ چناں چہ اللہ کے نیک بندوں پر باطل کا خاتمہ فرض ہے تا کہ دنیا میں انصاف اور امن کا بول بالا ہو۔

آں حضورؐ کے دیگر اصولِ حرب صبر و استقلال، استواری، نظم و ضبط، جنگ پر باقاعدگی سے عمل مستقل، ناگہانی عمل، اور آخیر تک جنگ تھے۔ آخرالذکر اصول پر چند الفاظ بے محل نہیں ہوں گے۔ جب افراد کسی دنیاوی مقصد، حصولِ علاقہ یا دولت یا ذاتی عسکری شہرت کے حصول کے لیے جنگ کرتے ہیں، تو ان کے مقاصد کچھ اتنے بلند نہیں ہوتے اور وہ جنگ کو آخری حد تک نہیں لے جاتے چوں کہ اس میں بہر حال زیاں کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی قوم اپنی ثقافت، اپنے ایمان، اپنے مذہب اور اپنے ایمان کی خاطر، جن کو وہ اپنی زندگی سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے، لڑتی ہے، تو اس میں شکست کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، چوں کہ شکست کے معنی ان اصولوں سے انحراف کے مترادف ہوتے جن کی خاطر وہ جہاد کے لیے تیار ہوئی تھی۔ چناں چہ امتِ اسلامی کا اس باب میں صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام کو اپنائے گی ورنہ زندہ نہیں رہے گی۔ آخری لمحے تک جنگ کی امید صرف ان ہی افراد سے کی جا سکتی ہے جن کو خدائے تعالیٰ، اس کے نبیؐ، قرآن پاک اور آخری لمحے تک جنگ پر ایمان کامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضورؐ نے کسی غیر مسلم کو جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے شرکت کی اجازت نہیں دی جب تک کہ وہ مشرف بہ ایمان نہ ہو گیا۔ چناں چہ ہم عین سنّت پر گامزن ہوں گے اگر ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ جو افراد اسلامی نظریۂ حیات پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کے دفاع میں بھی حصّہ دار نہیں ہو سکتے، چوں کہ وہ آخری لمحے تک اس نظریۂ حیات کے دفاع کے لیے نہیں لڑیں گے۔

مختصراً یہ عرض کر دینا کافی ہو گا کہ آں حضورؐ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح، ایک عسکری قائد کی حیثیت سے کلام پاک کے احکامات کی، جو خدا کا پیغام ہے اور آپؐ کو ودیعت فرمایا گیا ہے، مکمل شرح ہیں۔

اگر انسانی تاریخ میں کوئی معجزہ معرضِ وجود میں آیا ہے، تو وہ یہ ہے کہ ایک فردِ فانی دارِ فانی میں مختلف حیثیتوں سے رہا ہے، جن میں اس کی عسکری قیادت بھی ایک اعلا حیثیت رکھتی ہے۔ وہ قیادت ایک لافانی کتاب کے احکامات کے مطابق ہے جو خدائے لافانی کا ابدی پیغام ہے، اور اس کی شرح ہے۔

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
یکشنبہ، ۵ رمئی ۱۹۷۰ش

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

حضرت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
امیر جماعتِ اسلامی، پاکستان

الحمد للہ والصلوٰۃ والسّلام علیٰ رسول اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت کے جو دلائل قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک بڑی اہم دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاق حسنہ ہیں فرمایا گیا ہے: انّکَ لعلیٰ خلق عظیم۔ یعنی آپؐ اخلاق کے بلند ترین درجے پر ہیں۔

جو لوگ آپؐ کی نبوّت کو جھٹلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے آپؐ کے اخلاق کو پیش کیا ہے کہ اس اخلاق و کردار کے انسان کو تم کیسے جھٹلا سکتے ہو؟ اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی طرح کے تعصّب کے بغیر حضورؐ کی پاک زندگی پر نگاہ ڈالے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ اللہ کے رسولؐ کے سوا کسی اور کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

قریب ترین تعلّق رکھنے والوں کی شہادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مبارک زندگی کے دو دَور ہیں۔ ایک دَور نبوت سے پہلے کے چالیس سال کا اور دوسرا نبوّت کے بعد کے ۲۳ سال کا ہے۔ نبوّت کے بعد کے دَور میں بھی ۱۳ سال آپؐ نے مکّہ معظّمہ میں گزارے اور دس سال مدینہ منوّرہ

میں۔ نبوت سے پہلے کے چالیس سال میں آپؐ کی زندگی کیسی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے والی وہ ہستیاں تھیں جن کو سب سے زیادہ قریب سے آپؐ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مثلاً حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ حضرت علی رضؓ اور حضرت زید بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ان میں سے حضرت علی رضؓ کے متعلق ایک مخالف اسلام یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس وقت آٹھ دس سال کے بچے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پرورش کیا تھا، اس لیے اگر وہ اپنے سرپرست پر ایمان لے آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو پچپن سال کی سن رسیدہ خاتون تھیں۔ پندرہ سال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ تھیں۔ ایک بیوی سے بڑھ کر اپنے شوہر کی عادات وخصائل اور اخلاق و مزاج کو جاننے والا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضرت خدیجہ رضؓ کے متعلق تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ قریش کی نہایت فرزانہ اور دانش مند خاتون تھیں۔ پندرہ سال آپؐ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد حضورؐ کے متعلق ان کی رائے کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے غارِ حرا کا واقعہ بیان کیا تو انھوں نے ایک لمحے کا تامل کیے بغیر یہ تسلیم کر لیا کہ آپ صلعم کو واقعی اللہ نے اپنا نبی بنایا ہے۔ ان کو یقین آگیا کہ جب اس اخلاق و کردار اور سیرت کا انسان یہ بات کہہ رہا ہے کہ میرے پاس خدا کی طرف سے نبوت کا پیغام آیا ہے تو بالکل سچ کہہ رہا ہے۔

دوسرے شخص حضرت ابوبکر رضؓ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ہم عصر تھے یعنی وہ آپؐ سے عمر میں صرف دو سال چھوٹے تھے۔ وہ حضورؐ کے پرانے دوست اور ہم نشین تھے۔ دوست سے زیادہ دوست کو جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دوست، دوست کے عیب، صواب ہر چیز کو جانتا ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ اللہ نے آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا ہے تو انھوں نے بھی ایک لمحے کا تامل کیے بغیر تسلیم کر لیا کہ فی الواقع آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ ان کے دل میں سرے سے کوئی شک گزرا ہی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی زندگی ایسی پاکیزہ تھی اور آپؐ کا اخلاق و

کردار اتنا بلند تھا کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے آدمی کو فوراً یقین آگیا کہ آپؐ نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے ہیں۔

تیسرے شخص حضرت زید بن حارثہؓ ہیں۔ وہ پختہ عمر کے آدمی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کئی سال سے خادم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ کسی گھر کا خادم یا ملازم آدمی کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے۔ کوئی عیب یا صواب اس سے چھپ نہیں سکتا۔ حضرت زیدؓ نے بھی جس وقت حضورؐ کا دعوائے نبوت سنا، اسی وقت بغیر کسی شک کے اسے درست تسلیم کر لیا۔ ان کو بھی اس امر میں کوئی شک لاحق نہیں ہوا کہ آپ واقعی اللہ کی طرف سے نبی بنا کر مامور کیے گئے ہیں۔

دشمنوں کی تباہی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز ہونا ایک ایسی سچائی ہے کہ اس کی شہادت آپؐ کے بدترین مخالفوں کے طرزِ عمل میں بھی ملتی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت کا دعویٰ فرمایا اور عوام میں سرداران قریش آپؐ کی مخالفت کے لیے بڑی شدّت کے ساتھ کھڑے ہو گئے تو آپؐ کے کسی بد سے بدتر مخالف نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ جناب آپؐ نبوت کا دعویٰ کیا کر رہے ہیں، آپؐ یہ تو کہیں کہ آپؐ کی زندگی کیسی گزری ہے۔ آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ پر شاعر، ساحر اور کاہن وغیرہ کے مضحکہ خیز الزامات تو لگائے، لیکن آپؐ کا کوئی بدتر دشمن بھی آپؐ پر کبھی کسی طرح کا اخلاقی الزام نہیں لگا سکا۔

وقت کی شہادت

پھر ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ نبوّت سے پہلے کی آپؐ کی چالیس سالہ زندگی انتہائی پاکیزہ اخلاق کی تو تھی لیکن نبوّت کے دعوے سے ایک دن پہلے تک بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ آپؐ پہلے سے نبوّت کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک دن پہلے تک بھی کسی شخص نے آپؐ سے ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی، نہ آپؐ کا ایسا کوئی طرزِ عمل دیکھا تھا جس کی بنا پر اسے کبھی یہ خیال ہوتا کہ آپؐ کوئی مذہبی دعویٰ لے کر اٹھنے والے

ہیں۔ آپؐ کے دشمنوں نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ جناب آپؐ تو پہلے سے نبوّت کی تیاری کر رہے تھے اس لیے آپؐ کے اس دعوئ نبوّت کی حقیقت ہم کو معلوم ہے۔

ماحول کی شہادت

اس کے بعد اس بات پر بھی غور کیجیے کہ مکّۂ معظّمہ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جو تیرہ سال گزرے ہیں ان میں آپؐ ہی کے قبیلے اور بستی کے کچھ لوگ تھے، جنھوں نے آپؐ پر ایمان لانا قبول کیا۔ اور وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے آپؐ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ دونوں کے طرزِ عمل کو آپ دیکھیے۔ جو لوگ حضورؐ پر ایمان لائے تھے، وہ وہی تھے کہ جن کے درمیان چالیس سال آپ نے زندگی گزاری تھی اور حضورؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی نظر سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک آدمی اپنی بستی سے باہر جا کر تو اپنی بزرگی کے ڈھول پیٹ سکتا ہے اور لوگ اس کے معتقد بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ایک آدمی کے اپنے محلّے اور بستی کے لوگ، جن کے سامنے اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر ادھیڑ عمر تک زندگی بسر کی ہو، وہ اس وقت تک اس بات کے قائل نہیں ہو سکتے کہ یہ واقعی اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے جب تک کہ انھوں نے اس کی پاکیزہ ترین زندگی نہ دیکھی ہو۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لانے والوں نے چوں کہ آپ کو نہایت درجہ بلند اخلاق پایا تھا، اس لیے انھوں نے اس بات کا یقین کر لیا کہ حضورؐ جو نبوّت کا دعویٰ کر رہے ہیں، وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ اس کردار اور سیرت کے آدمی کو یقیناً اللہ کا نبی ہی ہونا چاہیے۔

دعوت اور کردار میں کوئی بُعد نہ تھا

اب آپ دشمنوں پر حضورؐ کے اخلاقی اثر کو دیکھیے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم دشمنانِ اسلام کی برائیوں پر تنقید فرماتے تھے۔ جن عیوب میں وہ معاشرہ مبتلا تھا، ان میں سے ایک ایک عیب پر حضورؐ گرفت فرماتے تھے اور لوگوں کو بھلائیوں کی تلقین کرتے تھے، لیکن یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ آپ کو جھٹلانے پر جو لوگ تلے ہوئے تھے، ان میں سے کسی شخص نے کبھی اٹھ کر یہ نہیں کہا کہ جناب آپ جن برائیوں سے ہمیں روک رہے ہیں

وہ تو خود آپ کی زندگی میں پائی جاتی ہیں، یا جن بھلائیوں کی طرف آپ ہمیں دعوت دے رہے ہیں، ان پر خود آپ کا عمل نہیں ہے۔

آپ کے بلند کردار کا آپ کے دشمنوں پر جس قدر اثر تھا، اس کا اندازہ صرف ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر میں نمونے کے طور پر صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

کردار کے سامنے بے بسی

سب کو معلوم ہے کہ مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بدترین دشمن ابوجہل تھا۔ ایک مرتبہ حضورؐ حرمِ مکہ کے ایک گوشے میں تشریف فرما تھے اور دوسری طرف سردارانِ قریش محفل لگائے بیٹھے تھے۔ اتنے میں مکے سے باہر کا رہنے والا ایک دوسرے قبیلے کا آدمی فریاد کرتا ہوا ان سردارانِ قریش کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرا اونٹ ابوجہل نے خریدا ہے مگر اب قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔ میں باہر کا آدمی ہوں اور میرا یہاں کوئی بھائی بند نہیں ہے آپ میری فریاد سنیں اور میرے اونٹ کی قیمت مجھے دلوائیں۔ سردارانِ قریش نے ازراہِ مذاق اس شخص سے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ سامنے جو صاحب تشریف رکھتے ہیں، ان کے پاس جاؤ، وہ تمھاری رقم دلوا دیں گے۔ وہ شخص ناواقف تھا۔ سیدھا آپؐ کے پاس گیا اور جا کر مدعا عرض کیا۔ سردارانِ قریش نے ایک آدمی پیچھے پیچھے روانہ کیا تاکہ وہ یہ دیکھے کہ وہاں کیا واقعہ پیش آتا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جا کر ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب وہ باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سامنے کھڑے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم نے اس شخص سے اونٹ خریدا تھا، لیکن اب اس کی قیمت دینے میں اسے بلا وجہ تنگ کر رہے ہو، اس کی قیمت ادا کر دو۔ ابوجہل سیدھا گھر کے اندر گیا اور واپس آ کر اس شخص کو اس کے اونٹ کی قیمت ادا کر دی۔

آپ اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کردار اور شخصیت کا کتنا زبردست اثر اس شخص پر تھا جو آپ کا بدترین مخالف تھا۔ کوئی شخص مکے میں یہ ہمّت نہیں رکھتا تھا کہ ابوجہل کو جا کر ٹوک سکتا مگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جا کر

اسے لوٹا اور ایک مظلوم کا حق اسے دلوایا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کے اخلاق کی بلندی سے مرعوب تھے، اور اس لحاظ سے آپ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اگر آپ کی زندگی میں کوئی ذرہ برابر جھول یا داغ ہوتا تو ابوجہل جیسا آپ کا بدترین دشمن اس کی طرف اشارہ کیے بغیر نہ رہتا، لیکن وہاں تو کوئی داغ تھا ہی نہیں۔ اب اس کے بعد آپ مدینہ طیبہ کی زندگی کو ملاحظہ کیجیے۔

پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک مثال

انسان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دس سال اس حیثیت میں زندگی بسر کی ہے کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ تمھارے لیے بہترین نمونہ حضورؐ کی ذات ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (تمھارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے)

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک معاشرے میں اور ایک پورے ملک میں لوگوں سے یہ بات کہہ دی جائے کہ یہ شخص تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی کو کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دیا تھا۔ آپ کی کوئی چیز پرائیویٹ نہیں تھی سب کچھ پبلک تھا۔ لوگوں کو ہر وقت اس بات کی اجازت تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود آپ کی زندگی کو دیکھیں، آپ کے اقوال کو سنیں اور لوگوں تک پہنچائیں، آپ کے افعال کو دیکھیں اور لوگوں سے بیان کریں، بلکہ ان کو یہ بھی اجازت تھی کہ وہ ازواج مطہرات سے آپ کی نجی زندگی کے متعلق بھی معلومات حاصل کریں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک ہستی پورے دس سال تک اس طرح عوام کے سامنے رہی کہ اس کی زندگی کا کوئی پہلو بھی ان سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ خدا کے رسولؐ کے سوا کوئی انسان اس آزمائش پر پورا نہیں اتر سکتا۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو اس آزمائش کے لیے پیش نہیں کر سکتا کہ ہر وقت، ہر پہلو سے اس کا جائزہ لے کر دیکھا جائے اور پھر کسی پہلو سے اس کے اندر کوئی عیب، کوئی نقص، کوئی خامی اور کوئی کمزوری نہ پائی جائے، بلکہ جس پہلو سے بھی اسے دیکھا جائے کامل درجے کا انسان

نظر آئے۔ اور اس کے متعلق فی الواقع لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں کہ ہاں یہی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ یہ مقام پوری انسانی تاریخ میں صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حاصل ہے۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی کو دیکھیے تو بہترین شوہر اور بہترین باپ ہیں۔ باہر کی زندگی کو دیکھیے تو بہترین دوست اور بہترین ہمسائے ہیں۔ معاملات میں جس شخص کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا ہے اس نے آپ کو کھرا پایا ہے۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں تو بے لاگ انصاف کیا ہے۔ غم بھی پیش آیا ہے، خوشی بھی دیکھی ہے، غصّہ بھی آیا ہے اور محبّت بھی کی ہے، لیکن کسی حالت میں حضورؐ کی زبانِ مبارک سے کسی شخص نے کوئی کلمہ حق کے خلاف کبھی نہیں سنا۔ دس سال تک لوگ ہر وقت اور ہر آن آپ کی باتیں سنتے رہے اور دنیا کے سامنے ان کو پہنچاتے رہے لیکن آپ کی زبان سے کبھی کوئی بات حق کے خلاف نقل نہیں کی گئی۔ حتّٰی کہ غصّے میں بھی کسی کے لیے برے الفاظ زبان پر نہ آئے۔ یہ شان کسی معمولی آدمی کی نہیں ہوسکتی۔

دشمنوں کے بھی دوست

اس کے ساتھ آپ یہ بھی دیکھیے کہ آپ کو بدترین دشمنوں سے جنگ بھی کرنی پڑی ہے لیکن آپ نے ان کے ساتھ بھی ہمیشہ انصاف ہی کیا ہے اور انصاف ہی نہیں بلکہ رحم کیا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ فتح کیا تو آپ کے سامنے وہ دشمن دست بستہ سر جھکائے کھڑے تھے جنھوں نے تیرہ سال تک مکّے میں آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اور ہجرت کے بعد مدینے میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ یہ تھا کہ ان سب کو معاف کر دیا اور فرمایا: ”لاتثریب علیکم الیوم۔“ یعنی آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ چناں چہ کسی شخص کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ بجز اس کے کہ جس سے کوئی جنگی جرم ثابت ہو۔ اس طرح گنتی کے چند آدمی ایسے نکلے کہ جن سے جنگی جرایم ثابت تھے۔ باقی سب کو معاف فرما دیا۔

ایفائے عہد کی تعلیم

حضورؐ کے ایفائے عہد کا یہ حال تھا کہ جن لوگوں نے ہمیشہ آپ کے ساتھ بدعہدیاں کی تھیں، ان کے ساتھ بھی آپ نے جواب میں کوئی بدعہدی نہیں کی۔ آپ کا کوئی دشمن بھی آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکا کہ آپ نے کبھی عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ معاہدات کی پابندی کا یہ حال تھا کہ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مکہ معظمہ سے کوئی شخص مسلمان ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجائے تو آپ اس کو مکے واپس کردیں گے لیکن مدینے سے بھاگ کر اگر کوئی شخص مکے آجائے تو قریش اس کو واپس نہیں کریں گے۔ جب یہ شرط طے ہوچکی تو حضرت ابوجندلؓ مکہ سے بھاگ کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ حال یہ تھا کہ ان کا سارا جسم زخمی ہورہا تھا اور بھاری بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں اسلام قبول کرچکا ہوں۔ لیکن مجھ پر سخت مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔ خدارا مجھے کفّار کے چنگل سے چھڑائیے۔ حضورؐ نے فرمایا: "بھائی معاہدہ طے ہوچکا ہے اس لیے اب میں کچھ نہیں کرسکتا"۔

غور کیجیے کہ چودہ سو مردانِ جنگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور سب کے سب تلوار بند تھے۔ آپ کے ایک اشارے پر حضرت ابوجندلؓ کو چھڑایا جاسکتا تھا۔ لیکن چوں کہ معاہدے کی شرائط طے ہوچکی تھیں اس لیے آپ نے اس معاہدے کے احترام میں صاف انکار کردیا اور انھیں اسی حالت میں واپس بھیج دیا۔ اس سے بڑھ کر ایفائے عہد کی کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔

رہبرِ کامل

غرض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے جس دَور کو بھی دیکھا جائے، آپ اس دَور کے ایک مردِ کامل نظر آتے ہیں۔ آپ کی ذاتِ اقدس انسانیت کا بلند ترین نمونہ تھی، جس پہلو سے بھی دیکھا جائے کوئی داغ اور کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ یہی وہ چیز ہے جس سے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ حضورؐ اللہ کے رسولؐ تھے اور ہمارے لیے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد رہبر۔ انسان کسی شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے سکتا اور

نہ اس کی پیروی اطمینان سے قبول کر سکتا ہے جب تک کہ اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ شخص ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد سیرت کا آدمی ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر کوئی انسان پوری انسانی تاریخ میں ایسا نظر نہیں آتا کہ جو اس درجے مکمّل اور قابلِ اعتماد سیرت و کردار کا مالک ہو۔ اس وجہ سے حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسی شخصیت جس کو انسانیت کا رہبر کامل مانا جائے، وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ والاصفات کے سوا کوئی نہیں۔ اگرچہ تمام انبیاء علیہم السّلام بھی بہترین رہبر تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السّلام کے متعلّق ہم کو یہ یقین بھی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بدولت حاصل ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے کیوں کہ جن دوسری کتابوں میں ان کا ذکر آیا ہے، ان کی موجودہ حالت میں ان کی حقیقی شخصیتوں کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہے اور ان کے اخلاق و کردار کا غلط نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

علاوہ بریں ان انبیاء علیہم السّلام کی زندگیوں کا کوئی ریکارڈ آج محفوظ نہیں ہے کہ ان کی پیروی کی جا سکے۔ ہم ان پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر چوں کہ ان کی زندگی کا صحیح ریکارڈ محفوظ نہیں ہے، اس لیے ان سے رہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں کہ جن کی زندگی کے متعلّق اتنا مکمّل اور مفصّل ریکارڈ محفوظ ہے کہ ہم زندگی کے ہر پہلو میں آپ کی زندگی سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلّق حضورؐ نے رہنمائی نہ دی ہو اور صحابہ کرامؓ نے اسے محفوظ نہ کر لیا ہو۔ شخصی زندگی ہو کہ خاندانی، تجارت ہو کہ حکومت، امن ہو کہ جنگ، غرض زندگی کے جس پہلو سے آپ دیکھیے ہر پہلو میں مکمّل رہنمائی موجود ہے۔

اب اگر کوئی شخص رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جیسی ہستی کے ہوتے ہوئے بھی دوسرے لوگوں کو اپنا رہبر مانتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ اندھا ہے، اس کو نظر نہیں آ رہا کہ روشنی کدھر ہے۔ ایک طرف اس کے سامنے رہنمائی کے لیے بہترین رہنما موجود ہے اور دوسری طرف وہ ان لوگوں کے پیچھے چل رہا ہے کہ جن کے متعلّق وہ خود بھی جانتا ہے کہ ان کی زندگی ہزار عیبوں سے پُر ہے۔ بالفرض اگر کسی شخص کی زندگی کا کوئی ایک پہلو اعلا درجے کا ہو بھی تو دوسرے پہلوؤں میں وہ انتہائی ناقص ہے اور اس قابل نہیں کہ رہنمائی کے لیے اسے دیکھا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد و محاسن تو اتنے ہیں کہ گویا ایک بحرِ زخار ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہمارا کام حضورؐ کو صرف خراجِ تحسین پیش کرنا نہیں ہے، (اگرچہ وہ بھی باعثِ اجر ہے) بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم عملاً حضورؐ کی پیروی کریں اور آپ کے اُسوۂ حسنہ پر چلیں۔ ہمارا صحیح خراجِ تحسین حضورؐ کی پیروی میں ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ○

شامِ ہمدرد، لاہور

جمعرات، ۷؍مئی ۱۹۷۰ء

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
کلام اللہ کے پیکرِ عمل

جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب
چیف جسٹس، ہائی کورٹ مغربی پاکستان

آج کے جلسے میں شرکت میرے لیے باعثِ فخر ہے اور باعثِ سعادت بھی، مگر جس ذاتِ پاک کا ذکر اس محفل میں ہے، اس کی تعریف میں زبان کھولنے سے مجھے شرمندگی سی ہوتی ہے، کیوں کہ میں ایک گناہ گار بندۂ خدا ہوں جس کا دل اور جس کے خیالات دنیا میں الجھے ہوئے ہیں۔ میرا دل ایسا کہاں ہے اور میری زبان ایسی کب ہے کہ اس منبعِ رحمت کی باتیں کروں جس کے اشاروں کی بلندیوں تک پہنچنے سے میری نظر اور میری بصیرت دونوں قاصر ہیں۔

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے چیئرمین حکیم محمد سعید صاحب نے اہتمام کیا ہے کہ رسولِ اکرم صلعم کے مختلف اوصاف پر بیس یا بائیس مقالے سارے ملک کے طول و عرض میں جگہ جگہ پڑھے جائیں۔ اہلِ علم اور اہلِ بصیرت اس کام کو سرانجام دیں گے۔ مگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ ظاہری صفات دل کی گہرائیوں کی جھلکیاں ہوتی ہیں جن سے دل کی اصلی کیفیت کا پورا اندازہ نہیں ہوتا۔ ایک تناور درخت کو یوں بیان کریں کہ وہ بلند قامت ہے اور اس میں سینکڑوں پھول اور درجنوں پھل ہیں تو اس سے اس کی اصلیت کی خبر

نہیں ہوتی۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا اجمالی اثر نظر اور ذہن پر کیا پڑتا ہے۔ اس کی باطنی تاثیر اور اصلیت تو اس کے بیچ میں ہوتی ہے مگر اس میں حسن جُزوی ہونے کے علاوہ بطور کل بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب ایک مضمون کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کیا جائے تو ان ٹکڑوں کا جو تعلّق مرکزی مضمون سے ہے، اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ شاید اسی لیے حکیم صاحب نے فرمائش کی ہے کہ مختصر طور پر تعارفِ مضمون پیش کروں۔

چناں چہ میری خواہش ہے کہ آپ کی اجازت سے پہلے سیرتِ رسولِ اکرم صلعم کی جو خاص اہمیت مسلمانوں کے لیے ہے، اس کا ذکر کروں۔ اس کے بعد رسولِ اکرم صلعم کے باطنی فضائل کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس ذاتِ پاکؐ نے خدا کی طرف سے کون سا سبق دیا ہے جس کے لیے اگر آج کی دنیا پورے طور پر ممنون نہیں ہے تو مزید تجربے اور مزید بصیرت کے حاصل ہو جانے کے بعد ہو گی۔

رسول اللہ صلعم کی سیرت کا بیان مسلمانوں کے لیے خاص الخاص اہمیّت رکھتا ہے۔ وہ ایک اعلا ہستی کی سرگزشت ہی نہیں ہے جس کو پڑھ کر یا سن کر تذکروں کا سا لطف حاصل کیا جائے اور نہ فقط یہ مقصد ہے کہ اپنے رہبر کی تعریف و توصیف کر کے خود اپنے جذبۂ فخر و مباہات کو تسکین دی جائے یوں تو ہر شخص کے دِل میں اپنے کسی بزرگ کی بڑائی کرنے سے تقویّت پیدا ہوتی ہے اور اپنے بزرگوں کی بڑائی کرنے سے خود اپنے اوپر ان کی بزرگی کا پرتو پڑتا ہے۔ چناں چہ اسی لیے ہر زمانے میں آنے والی نسلیں اپنے سلف کے تذکرے کرتی ہیں۔ عقیدت مندوں کے لیے تو خاص طور پر عقیدت کے پھول بکھیرنے سے ان کی خوش بو مشامِ جان کو معطّر کرتی ہے۔ مگر مسلمانوں کے لیے رسول اللہ صلعم کی زندگی اسلامی زندگی کی مثال اور نمونہ ہے۔ اور نمونہ بھی اس لیے نہیں کہ جیسے ہر پیغمبر کی زندگی اس کی امّت کے لیے روح پرور ہو سکتی ہے، بلکہ اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے خود رسولِ اکرمؐ کی زندگی کو مسلمانوں کے لیے کلام اللہ کی ہدایت کا عملی پیکر بنا کر بھیجا ہے۔ بہت سی ہدایتیں ان کی ہدایت سے مکمّل ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سی ہدایتیں ان کی مثال سے پیکرِ عمل بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ چناں چہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ؕ

یعنی مسلمانو! تمھارے لیے رسول اللہؐ بہترین نمونۂ عمل ہیں۔

مجھے جو چیز حضورِ اکرم صلعم کی ذات بابرکات میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کا پتا بتایا۔ بندوں کو اُس سے ملایا۔ اس کی خدمت و عظمت میں اپنی ساری زندگی تج دی، مگر اپنے آپ کو خدا کی ذات سے اِس طرح علاحدہ رکھا کہ کبھی یہ فرق نہ مٹا کہ وہ خدا کے بندے اور خدا کے پیغام بر تھے، اور خدا کی ذاتِ اعلا وارفع ہی مالکِ مطلق تھی اور رہے گی۔ مسلمانوں کو اُن سے جو والہانہ محبّت اور عقیدت تھی، وہ آج بھی ایسی ہے کہ مسلمان ہر بے حرمتی کو برداشت کر سکتا ہے مگر نہیں کر سکتا تو رسولِ اکرمؐ کی سُنّت کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔ ذرا سی لغزش اس بات کے لیے کافی تھی کہ ان کی ذات سے بندگی اور خداوندی کے فرق کو مٹا دیتی۔ مگر وہ احتیاط تھی اور وہ دفورِ بندگی تھا کہ اس کا احتمال بھی ہونے نہیں پایا۔ آج بھی ساری اُمّت کو ان کے وہ فرمان یاد ہیں جن کو مولانا حالیؔ نے اِس طرح نظم کیا ہے:

بنانا نہ تُربت کو میری صنم تم
نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

ان کی زندگی حسین اور محتاط تھی۔ اس میں اصول کی احتیاط تھی مگر خدا کی راہ میں سرفروشی بے دھڑک اور بے باک تھی، اور یہ ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی انسان میں بہت سی خوبیاں ہوں تو بس وہ پیغمبر نہیں ہو جاتا۔ جو درجہ پیغمبر کو حاصل ہوتا ہے وہ نہ نیکی سے، نہ شجاعت سے نہ سپہ سالاری سے، نہ فراست سے، نہ فلسفے سے، نہ فقیری سے اور نہ حکومت سے میسّر آتا ہے۔ دنیا میں ایسے انسان گزرے ہیں جن میں بہت سی خوبیاں تھیں اور بعض خوبیاں بدرجۂ اتم تھیں، مگر وہ صرف تعریف کے قابل تھے، عزّت کے قابل تھے اور بسا اوقات رہبری کے قابل بھی تھے، مگر رہبرِ انسانیت نہیں تھے۔ انسانیت کی رہبری کے لیے ایسے سبق کے دینے کی قابلیت درکار ہے جس سے انسان کو نچلے درجوں سے ابھار کر اونچے سے اونچے درجوں تک پہنچایا جا سکے جب تک ایسا پیغام دینے والا نہ ہو اور خود اس پیغام کی مثال نہ بن جائے۔

اس وقت تک سب فن، سب کمال، سب کرامت اور سب کشف مقابلتہً ہیچ ہے جس میں رہبرِ انسانیت بننے کا وصف ہو اور وہ بھی ایسا کہ وہ خود مجسّم ہدایت بن جائے تو وہی خدا کی مرضی سے رسول بن سکتا ہے۔ خواہ اس میں سارے علوم و فنون یک جا ہوں یا نہ ہوں۔ حضرت آدمؑ سے لے کر رسولِ اکرمؐ تک ہزاروں پیغمبر دنیا میں آئے، جن میں اوصاف حمیدہ مختص تھے مگر پھر بھی سب پیغمبر تھے کیوں کہ انسانیت کے رہبر تھے رسولِ اکرمؐ کی برتری بحیثیت پیغمبر کے جمیع اوصاف حمیدہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے پیغام کی برتری سے ہے۔ آپ کا عمل ایسا تھا کہ آپؐ کی ذات اور آپؐ کے پیغام میں کوئی فرق نہ تھا۔ کسی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے درخواست کی کہ وہ رسول اللہ صلعم کے اوصاف بیان فرمائیں، انھوں نے جواب دیا کہ تم نے قرآن کریم پڑھا ہے بس آں حضرتؐ وہی تھے جو قرآن پاک ہے۔

قرآن پاک کے بیانات سادہ اور آسان ہیں مگر ان ہی سادہ بیانات میں وہ سادے اصول حیات ہیں، جن کی بلندی اور وسعت انسان اپنی استعداد کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔

جب تک انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا اس آیت کا مفہوم کہ :- لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اس طرح کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا جس طرح آج آتا ہے۔ کلامِ پاک میں یہ دعوت بھی ہے: یتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اس کا مناسب مفہوم کیا ہے کیوں کہ اب تک انسان نے آسمانوں میں جانے کی جو کوشش کی ہے مگر آسمانوں کی عدم سے وجود کی ماہیت پر کبھی کامیابی سے غور نہیں کیا ہے۔ جس دن تخلیق کی ماہیت کا اندازہ ہوا تو اس دعوت کے معنی بھی زیادہ کھل جائیں گے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی عالم فاضل کی سادہ تحریر بھی پڑھنے والا اس مفہوم کو اسی حد تک سمجھ سکتا ہے۔ جتنا کہ اس کا اپنا مبلغ عِلم ہوتا ہے اور اس کی اپنی بصیرت ہوتی ہے۔ چناں چہ بزرگانِ دین میں سے بعض نے کہا ہے کہ میں جتنی دفعہ قرآنِ پاک کو پڑھتا ہوں میری سمجھ میں اس کے نئے معنی آتے ہیں۔ ایسے اقوال یہ ظاہر نہیں کرتے کہ اُن کے لیے کلامِ پاک کے معنی بدل جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔

میں عالمِ دین نہیں ہوں مگر مبلّغینِ اسلام کی تحریریں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان تحریروں میں میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ کسی نے اسلام کو ارتقائے روح اور ارتقائے انسانیت

کا دین کہا ہو۔ اُس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ ارتقا کا تصور بطور ایک مضمون کے پہلے زمانے میں تھا ہی نہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو ارتقائی بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تقریباً چودہ سو سال پہلے جب یہ تصور بحیثیت ایک مضمون کے موجود ہی نہ تھا، اس وقت ارتقائے روح اور ارتقائے انسانیت کو مقصودِ ہدایت بنایا گیا تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

میرے اس خیال کی تائید کہ اسلام ایک ارتقائی دین ہے، اسلام کی چند ہدایات سے ہوتی ہے۔ اول یہ کہ کلامِ پاک میں آیا ہے کہ اسلام وہی دین ہے جو حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا دین تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل دین وہ ہے جو اِن سارے پیغمبروں کی تبلیغ میں مشترک ہے۔ ان میں جو اختلاف ہیں، اِن کو شاہ ولی اللہؒ نے یہ کہہ کر سمجھایا ہے کہ "اختلاف اگر ہے تو فقط شرائع اور منہاج میں ہے۔" اور اس اختلاف کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ "یاد رکھو انبیاءِ علیہم السّلام کی شرائع کا مختلف ہونا بعض خاص اسباب اور مصالح کی بنا پر ہوتا ہے عبادات اور دیگر فرائض کے تعین میں اُس قوم کی حالت اور اُن کی عادات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، جو اُس کی مخاطب ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ "انبیاءِ علیہم السّلام کی تعلیم و تلقین کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ لوگوں سے ان ہی کی عقل و ذہانت اور ان ہی کی فہم اور استعداد کے مطابق گفتگو کریں۔

ہزاروں انبیاء آئے اور یہی کام سرانجام دیتے رہے حتیٰ کہ رسولِ اکرم تشریف لائے اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کر دیا، جس کے یہ معنی ہیں کہ تعلیم اور تربیت کے سلسلے سے انسانیت اُس درجے پر پہنچ گئی جہاں کہ مکمل دین اس کو دیا جاتا۔ مزید یہ کہ بتدریج سبق دینے کا لازمہ تھا کہ مدارج تعلیم سے گزرتے ہوئے ایک ایسے مرحلے پر انسانیت پہنچ جائے کہ پھر کس استاد کی ضرورت باقی نہ رہے، ورنہ تعلیم ناقص ہوتی کیوں کہ وہ طالب علم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے استاد کا محتاج کر دیتی۔ بہ الفاظِ دیگر اسلام کے آجانے کے بعد انسانیت فارغ التحصیل ہو گئی۔ ڈاکٹر اقبال اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

"اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا۔

موروثی بادشاہت کو جائز نہیں کیا، بار بار عمل اور تجربے پر زور دیا۔ عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا۔ اِس لیے کہ اس کے اندر یہی (یعنی خود اعتمادی پیدا کرنے کا) نکتہ مضمر ہے (اور) کیوں کہ یہ سب تصوّر خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔"

انسان کو بتا دیا گیا ہے کہ اُن بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر جو دین ہے وہ نئے نئے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ یہ ارتقائی مقصد نہ صرف افراد کے لیے ہے بلکہ اقوام کے لیے بہ حیثیت جماعت کے بھی کار فرما ہے۔ چناں چہ قرآنِ پاک میں ان قوموں کے قصّے دہرائے گئے ہیں، جو گمراہ ہو کر من حیث القوم تباہ ہو گئیں اور خود مسلمانوں کو بھی بتا دیا گیا ہے کہ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

انفرادی روحانیت کا ارتقا اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ گناہ کو گناہ گار کا اپنے نفس پر ظلم بتایا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ غلط کاری سے روح کے اِرتقا کو نقصان پہنچتا ہے۔ جب حضرت آدمؑ نے جنّت سے بے دخلی کے بعد دعا مانگی تو کہا کہ ربنا ظلمنا انفسنا یعنی اے میرے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

اسلام میں اِرتقا کا تصوّر انفرادی بھی ہے، اجتماعی بھی ہے اور عالم گیر بھی ہے۔ نبوت خود ایک اِرتقائے اعلا ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں: "نبوّت ولایت کی ایک پُراسرار صورت ہے جس میں اتحادِ الٰہی کے حاصل ہو جانے کے بعد ایک طاقت اِس مقصد کے لیے اُبھرتی ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت کو بہ ذریعۂ تلقین اس پر آمادہ کرے کہ وہ بھی اتحادِ الٰہی سے بہرہ ور ہو جائے۔

رسولِ اکرم صلعم کو جو معراج نصیب ہوئی، وہ ان کی امّت اور بنی نوعِ انسان کے لیے ایک مثال اور ہدایت ہے کہ بلند سے بلند تر مدارج کی آرزو رکھیں۔ چناں چہ شبِ معراج کے متعلق ڈاکٹر اقبال کے الفاظ یہ ہیں، اور میں اپنی گفتگو اِن ہی پر ختم کرتا ہوں ؎

رہِ یک گام ہے ہمّت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

شامِ ہمدرد، لاہور
جمعرات، ۷، مئی ۱۹۷۰ء ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
قانون ساز و منصف

جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب
سابق چیف جسٹس آف پاکستان

قانون کا لفظ لغوی اعتبار سے یونانی لفظ "کالون" سے ماخوذ ہے جو سریانی کی وساطت سے عربی زبان میں داخل ہوا۔ اس میں اس کے معنی "سیدھی سلاخ" یا مسطر کے تھے، پھر اس کا اطلاق "قاعدہ" پر ہونے لگا۔ آج کل یہ لفظ یورپی زبانوں میں بمعنی قانون کلیسا مستعمل ہے۔ فقہ اسلامی میں "قانون" کے بجائے "شرع"، "شریعت" یا "حکم شرعی" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ میں لفظ "قانون" کا اطلاق اکثر ان سرکاری احکام پر ہوتا تھا جنھیں حکومت جاری کرتی تھی تاکہ احکامِ شرع سے ان کی تمیز ہو سکے۔ اسلامی تصوّر حیات کے مطابق، شارعِ حقیقی صرف ذاتِ باری تعالےٰ ہے جس نے وحی کے ذریعے، دین و دنیا دونوں پر حاوی ہدایت، رسولِ اکرمؐ کی زبانِ حق ترجمان پر نازل ہوئی۔ لہذا فقہِ اسلامی میں عبادات، معاملات اور عقوبات سب کو علوم دینیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مختصر مقالے میں ہم "قانون" سے امورِ مدنیت سے متعلّق وہ جامع اور ضروری قواعد مراد لیں گے۔ جن کی پابندی ایک متمدّن معاشرے میں لابدی ہوتی ہے اور جن کا نفاذ بہ صورتِ مخاصمہ اولی الامر کی معرفت کرایا جا سکے۔ اس تعریف کی رُو سے وہ دینی یا اخلاقی ضوابط و

قواعد، جن کی خلاف ورزی ریاستی سطح پر قابلِ مواخذہ نہیں۔ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

اسلامی قانون سازی کا پہلا دور رسولِ اکرمؐ کی بعثت یعنی ۶۱۰ ش سے لے کر آں حضرتؐ کی وفات یعنی ۶۳۲ ش تک پھیلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ اسلامی قانون کا اصلی اور بنیادی سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے جس کی آیات بائیس سال سے کچھ زیادہ عرصے میں وقتاً فوقتاً بذریعہ وحی قلب و زبان رسولِ مقبولؐ پر اتاری گئیں۔ اسلام کے سیاسی ثم معاشرتی نظام میں قرآنِ حکیم بمنزلہ دستورِ اساسی کے ہے۔ کوئی اقدام خواہ قانونی ہو یا کسی اور نوعیت کا، قرآنی احکام یا اصولوں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا قانون بنایا جائے جو قرآنی نص کا نقیض ہو تو اسلامی ریاست کے نزدیک وہ کالعدم ہو گا۔ عام دساتیرِ اساسی سے قرآنی دستور اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کے متن میں کوئی انسانی ادارہ یا فرد ترمیم و تبدّل کا مجاز نہیں۔

اس ابدی اساس کے ہوتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں قانون سازی کی کہاں تک گنجائش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماسوائے چند ایک مخصوص موضوعات کے جن کے متعلق احکامِ قانونی قرآن مجید میں بالتصریح موجود ہیں، دیگر امور میں اصولی رہنمائی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور ان امور میں ذیلی یا جزئیاتی قواعد کا تعیّن حکمتِ شارع نے مکان و زمان کے امکانی تغیرات کے پیشِ نظر، امت کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے تاکہ دین میں تنگی کے بجائے آسانی ہو۔ شرط یہ ہے کہ یہ ذیلی یا جزئیاتی قواعد قرآنِ حکیم کے غیر متبدّل اساسی اصولوں یا روحِ دین کے منافی نہ ہوں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ حضورؐ رسالت مآب نے ارشادِ خداوندی:۔

یاایہاالذین اٰمنوالا تسئلوا عن اشیاءَ ان تبد لکم تسؤکم

کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معاملات یا عبادات کے متعلق زیادہ کرید یا سوالات کرنے سے منع فرمایا تاکہ دین منجمد ہو کر نہ رہ جائے۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ اپنے اوپر سخت گیری نہ کرو مبادا اللہ تعالیٰ بھی تمھارے ساتھ سختی سے پیش آئے۔

پھر یہ بات بھی سزاوار اعتنا ہے کہ قرآن مجید بعض مسائل کے تصفیے کو "عرف" یعنی رسوم و عادات کے مروّجہ پیمانوں پر مبنی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رسم و رواج اختلاف زمان و مکان کے باعث تغیّر پذیر ہو سکتے ہیں۔ البتّہ یہ رواجی قاعدے بھی نص یا

اصولِ قرآنی سے متعارض نہ ہونے چاہئیں نصوص یا بنیادی اصولوں کا خاص واقعات پر اطلاق بھی تعبیر و تفسیر کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآنی احکام کی تعبیر و تفسیر کے لیے سنّت رسولؐ سے بہتر رہنمائی ممکن نہیں۔ ایک بظاہر عام قرآنی حکم کی تخصیص یا ایک بظاہر خاص حکم کی تعمیم یا ذیلی جزئیات کی تصریح کی متعدد مثالیں ہمیں احادیث میں ملتی ہیں۔ البتہ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر میں اشارہ کیا ہے۔ بعض قانونی نوعیت کی احادیث کے متعلق یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر منحصر ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسولِ اکرمؐ نے علیٰ حالہٖ قایم رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ کیا ان رسوم و رواج کو جن سے تعرض نہ کیا گیا، ہمیشہ کے لیے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا؟ شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس قوم کی ہدایت کے لیے وہ مامور ہوتے ہیں۔ ان میں از تفاقات کی مروّجہ صورتوں کی اصلاح کریں ان کی مالوفات کو یکسر ان سے چھڑا دینے کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا الّا یہ کہ بعض خاص صورتوں میں بہ تقاضائے مصلحت ایسا کرنا پڑے۔ تاہم تشریح میں ان علوم و عادات کو ترجیح دی جاتی ہے جو کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ ان رسم و رواج کے سانچے ابدی نہیں ہوتے۔

ان گزارشات سے روشن ہوگا یہ مفروضہ کہ قرآنی نظام قانون ایک جامد ضابطہ یا بند محیط ہے جس میں اتنی لچک نہیں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات و مقتضیات کا ساتھ دے سکے، صحیح نہ ہوگا۔ اجتہاد کا اصول اس نظام کو ایک حرکی اور ترقی پذیر ضابطۂ حیات کی صورت دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شارعِ حقیقی کی حکمتِ بالغہ نے دینِ کامل میں مخصوص حدود کے اندر مستقبل کی ضرورتوں سے ہم آہنگی کی گنجائش رکھی ہے اور غالباً یہ وہی منطقہ فکر و عمل ہے جو فقہی اصطلاح میں 'مباح' کے زیرِ نگیں ہے۔ ابن قیمؒ، اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ "احکام کی تبدیلی اور اختلافِ زمان، مکان، احوال، نیت اور عاداتِ انسانی کے اختلاف کے ساتھ وابستہ ہے"۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ "معاشرۂ انسان اور قانون کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے جس نے شریعتِ اسلامی کا دائرہ بالکل محدود کر دیا ہے۔ حالاں کہ وہ نہیں سمجھتے کہ جس شریعتِ اسلامی میں مصالحِ انسانی کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا، اس میں ایسے تنگ نظریوں کی گنجائش نہیں ہے"۔

نظریۂ اجتہاد

اجتہادی نظریے کی تصدیق معاذ بن جبلؓ والی حدیث سے ہوتی ہے جسے ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آں حضرتؐ نے ان کو یمن روانہ کیا تو دریافت فرمایا کہ جب کوئی معاملہ تیرے سامنے آئے گا تو تو کس طرح اس میں فیصلہ کرے گا؟

عرض کیا۔ "کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔"

فرمایا "اگر کتاب اللہ میں اس بات کو نہ پائے؟"

عرض کیا۔ "رسول اللہؐ کی سنّت کے موافق فیصلہ کروں گا۔"

فرمایا۔ "اگر سنّت رسول اللہؐ میں بھی وہ بات نہ ملے؟"

عرض کیا۔ "اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔"

یہ سن کر رسول اللہؐ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔ "تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے رسول اللہؐ کے رسول کو اس امر کی توفیق دی کہ راضی ہوا اس سے اللہ کا رسولؐ۔" یہ حدیث گویا اجتہاد کا منشور ہے اور ہمارے لیے ہدایت کا ابدی سرچشمہ ہے۔

قانونی نوعیت کی احادیث

اب ہم ان قانونی نوعیت کی احادیث کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں جن سے کسی اصول یا قاعدے پر روشنی پڑتی ہو۔ اس مختصر صحبت میں ساری متعلقہ احادیث کا احاطہ کرنا یا تمام مسائل کو لپیٹ لینا ممکن نہیں۔ اس لیے ہمیں رسالت کے سراج منیر کی چند کرنوں پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔

رسولِ کریمؐ کی قانونی تصریحات کے پس منظر کے طور پر ایّام جاہلیت میں عرب کی حالت کا مختصر ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی اپنی کتاب "فلسفۃ التشریع فی الاسلام" میں لکھتے ہیں کہ "اسلام سے قبل عرب معاشرہ منتشر قبائل کے مجموعے سے عبارت تھا جس میں کسی مرکزی حکومت کی شیرازہ بندی نہ تھی۔ ہر ایک فرد اپنے قبیلے سے وابستہ تھا۔ خواہ قرابت داری کے ذریعے سے ہو یا باہمی عہد و پیمان کے واسطے سے چناں چہ وہ اپنے قبیلے کی جنبہ داری کرتا تھا اور بیرونی دشمن کے مقابلے میں قبیلے کی حمایت میں سینہ سپر رہتا تھا۔ قبائل

کے درمیان جنگ و جدل عام تھا اور اس کے ساتھ لوٹ مار، مردوں اور عورتوں کو قید کرنے اور لونڈی غلام بنانے کا عام رواج تھا۔ ان کا اقتصادی نظام سادہ تھا۔ کام کرنے کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ان کے معاملات کی حیثیت عرضی تھی۔ یعنی قدیم رسوم و عادات پر مبنی۔ عورتوں کا معاشرے میں درجہ نہایت پست تھا۔ عار یا فقر و فاقے کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ کثرتِ ازدواج کے باعث بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ متعہ یا نکاحِ موقت کا بھی عام رواج تھا۔ شوہر بلا کسی پابندی یا شرط کے طلاق دینے کا مجاز تھا اور عورتیں اور بچے حق وراثت سے محروم تھے۔

رسولِ اکرمؐ کی ذات بابرکت کے باعث حکومتی سطح پر شوریٰ کا نفاذ ہوا اور حاکم کے لیے نصوصِ مقدسہ کی پابندی اور مصلحت عامہ کی رعایت ضروری ٹھہری۔ عدل و احسان مساوات اور اخوت انسانی کے اصول نافذ ہوئے۔ قبیلے کی عصبیتی یا جارحانہ لڑائی ممنوع اور دفاعی جنگ مباح قرار پائی۔ امن و امان کی تاکید ہوئی۔ عورت اور معذور لوگوں کی حالت بہتر ہو گئی۔ انفرادی ملکیت کی حرمت قائم ہوئی۔ عہد و پیمان کی پابندی واجب ٹھہری اور دھوکہ بازی یا حیلہ پردازی کی مختلف صورتیں زیرِ امتناع آئیں۔

قانون کا ایک حصہ بین الاقوامی معاہدوں سے تعلق رکھتا ہے۔ عہد نبویؐ کے سیاسی آثار میں سے ایک نمایاں واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد رسولِ اکرمؐ نے مدینہ میں ایک وفاقی حکومت کی بنیاد رکھی، جس کے صدر اعلا خود حضورؐ تھے۔ اس تحریری معاہدے کا متن، جو اس موقعہ پر تیار ہوا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب "الوثائق ایسا سیہ" میں درج کیا ہے۔ فریقِ معاہدے ایک طرف رسولِ اکرمؐ اور مہاجرین و انصار تھے اور دوسری طرف مدینہ کے تمام یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلم باشندے۔ تمام فریقوں کو سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت دی گئی۔ مدینہ پر حملہ کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریقوں کی حمایت کرنے کی پابند تھی۔ اور دشمن سے صلح کی صورت میں ہر نوع کی منفعت میں مسلمانوں کی مانند دوسرے شرکاء بھی متمتع ہونے کا حق رکھتے تھے۔ ہر فرد کا فرض تھا کہ اپنے ہمسائے کی طرف داری اپنے نفس کی مانند کرے۔ انصاف رسانی پوری جماعت کا فریضہ قرار پائی۔ اس بارے میں کسی رشتے داری یا قرابت کا پاس و لحاظ ممنوع ہوا۔ ایک شق معاہدہ کی یہ بھی تھی کہ کسی قاتل یا مجرم

کو کوئی شخص پناہ نہ دے سکے گا۔ فدیہ اور دیت وغیرہ کے اصول حسب سابق رہے۔ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا نظام قایم ہوا۔ باہمی اختلافات یا نازعات کا مقدمہ خود رسولِ اکرمؐ کے فیصلے پر موقوف تھا۔ آں حضرتؐ غیر مسلموں کے مقدمات میں ان کے اپنے شخصی قانون کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ یہ فقید المثال معاہدہ بعد میں قبائل یہود کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ان کی فتنہ پردازیوں کی نذر ہو گیا۔ ہمارے ہاں اقلیتوں کے مسائل کا حل شاید اس تاریخی معاہدے کی روشنی میں دریافت ہو سکے۔

بین قومی معاہدوں کا جو حشر مبیّنہ متمدّن مغربی اقوام کے ہاتھوں ہوتا آیا ہے کسی تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے جس جماعت یا فرد کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا، خود اس کی پابندی کی اور اپنے پیروؤں سے پوری دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل کروایا۔ صلح حدیبیہ اس ضمن میں فقید المثال ہے۔ یہ معاہدہ کفّارِ قریش اور آں حضرتؐ کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر ہوا اور اس کے کاتب حضرت علیؓ تھے۔ اس معاہدے کی رو سے فریقین میں دس سال کے لیے جنگ ممنوع قرار پائی۔ ایک شرط معاہدے کی یہ تھی کہ اس عرصے میں اگر مسلمان مکّہ میں حج عُمرہ یا تجارت کے لیے وارد ہوں تو اہلِ مکّہ پر ان کی جان و مال کی ذمّے داری ہو گی اور اگر قریش تجارت کے لیے مدینہ کی راہ سے مصر یا شام کی طرف عازم ہوں تو مسلمان ان کی جان اور مال کی حفاظت کے ذمّے دار ہوں گے۔ ایک اور شق کے مطابق اگر اہلِ مکّہ میں سے کوئی شخص اپنے خاندانی سربراہ کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر مدینے چلا آئے تو اس کا مکّے لوٹا دینا رسولِ اکرمؐ پر واجب تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینے میں سے اسلام ترک کر کے مکّے میں پناہ گزین ہو تو قریش اس کی واپسی پر مکلّف نہ ہوں گے۔ بظاہر اس شق کے ماتحت فریقین کے حقوق مساوی نہ تھے لیکن جب ابوبصیرؓ، جنھیں صاحب عیص بھی کہا جاتا ہے، مکّے سے فرار ہو کر مدینے پہنچے تو آں حضرتؐ نے اہلِ مکّہ کے دو ایلچیوں کے ہمراہ انھیں واپس جانے کا حکم دیا۔ ابوبصیرؓ نے تعمیلِ ارشاد کی۔ جب تینوں ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابوبصیرؓ نے حیلہ سے اپنے ایک محافظ کی تلوار پر قبضہ کر کے، اسے ختم کر دیا اور پھر بھاگ کر رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضورؐ نے فرمایا "تم بڑے لڑاکا ہو۔ اگر دوسروں کے ہمراہ بھی تھوڑے آدمی ہوتے تو فریقین میں جنگ چھڑ جانا مشکل نہ تھا۔" قریش کا دوسرا آدمی بھی بدحواسی کے عالم میں

رسولِ اکرمؐ کے پاس شکایت کے لیے پہنچا۔ یہ رنگ دیکھ کر ابو بصیر چپکے سے نکل گئے اور عیص کے مقام پر جاکر مقیم ہو گئے۔

یہ واقعہ ملک میں مشہور ہو گیا تو اہلِ مکّہ میں سے اس زمرے کے اور لوگوں نے بھی عیص کا رخ کیا اور اس طرح وہاں گویا مجاہدین کی ایک نوآبادی بن گئی۔ جو قریش کے قافلوں کے لیے خطرہ بن گئی چناں چہ قریش نے خود معاہدے کی اس شق سے دست برداری دے دی اور عیص والے مدینہ آگئے۔ ابو بصیر اس اثنا میں وفات پا چکے تھے۔

روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ نے جاسوسوں کے قتل کی اجازت دی۔ یہ بات زمانِ حاضر میں بھی سیاست ملکی اور جماعتی سلامتی کے موافق سمجھی جاتی ہے۔ خصوصاً جنگ کے ایام میں۔ قاصدوں کے بارے میں حضورؐ کا فرمان تھا کہ ان کا قتل ممنوع ہے۔ ان کے ارشاد کے مطابق قاصد کا روک لینا اور اس سے کسی قسم کا تعرض بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ مفتوح جماعتوں یا قوموں پر صرف جزیہ عائد کیا جاتا تھا۔ اور ان کے مال و جان کی حفاظت کی ذمّے داری اسلامی ریاست پر قائم ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے ذمّیوں کو جنگی خدمت سے معاف رکھا جاتا تھا اور کسی قسم کا دیگر بار ان پر نہ ڈالا جاتا تھا۔ پھر ان کے معذور یا نادار لوگوں سے جزیہ بھی وصول نہ کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال وہ وثیقۂ امان ہے جو حضورؐ نے تیما کے یہود بنی عادی کے لیے لکھوا دیا تھا۔

ریاست کے معاملات

اب معاملاتِ ریاست پر ایک نظر ڈالیے۔ آیۂ شریفہ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" ہمیشہ حضورؐ کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ چناں چہ جب حضورؐ نے حضرت معاذ رضؓ کو یمن روانہ فرمایا تو انھیں خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ جب زکواۃ وصول کرو تو لوگوں کے نفیس اور منتخب مال کو زکواۃ میں لینے کی کوشش نہ کرنا اور مظلوموں کی بددعا سے بچنا، اس لیے کہ بد دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ یہ روایت صحیحین میں ہے۔ زکواۃ ہی کے سلسلے میں حضورؐ نے قبیلۂ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ نامی کو زکواۃ کی وصولی پر مامور فرمایا اور بعد میں جب معلوم ہوا کہ اس نے زکواۃ کے علاوہ تحفے کے طور پر کچھ چیزیں زکواۃ دینے والوں سے لی ہیں، تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اس کے فعل کو زکواۃ کے مال میں

خیانت سے تعبیر فرمایا۔ گویا حضورؐ نے صراحت فرما دی کہ حرام وسائل بھی حرام ہیں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں کہ راش یعنی اس شخص پر بھی لعنت فرمائی جو راشی اور مرتشی کے درمیان واسطہ ہے۔

معدلت گستری سے متعلق احادیث میں ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ جب اسلامی عمل داری کا کام مدینے کی حدود سے بڑھ گیا تو حضورؐ نے چند مفتی یعنی قاضی مدینے میں مقرّر فرمائے جن کے فیصلوں کے خلاف آں حضرتؐ کے پاس مرافعہ بھی ہوتا تھا۔ کتانی نے اپنی کتاب التراتیب الاداریہ میں بحوالہ ابن الجوزی و مؤطا اس تنظیم کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقدمات کے لیے حضورؐ نے موقتی قاضی بھی متعین فرمائے۔

سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرتؐ نے حضرت عمروؓ بن العاصؓ سے فرمایا کہ ان دو آدمیوں کا قضیہ چکا دو۔

کہا "کیا آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟"

فرمایا "ہاں!"

کہا "کس صورت میں؟"

فرمایا "اس طور پر کہ اگر اجتہاد کرو اور صحیح چیز پر پہنچو تو دس نیکیوں کا ثواب ہوگا اور اگر خطا کر جاؤ تو ایک نیکی شمار ہوگی۔"

حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ جب حاکم غیظ و غضب میں ہو تو دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ ٹھنڈے دل سے معاملے کے حسن و قبح پر غور نہ کر سکے گا۔

ایک اور حدیث میں اجتہاد کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے "جب حاکم حکم لگانے پر آمادہ ہو تو اجتہاد کرے (یعنی معاملہ پر خوب غور و خوض کرے) اگر اس کا فیصلہ حق بجانب ہوگا تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر فیصلے میں باوجود پوری کوشش کے غلطی رہ جائے تو اسے ایک اجر ملے گا۔"

یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ ساتھ ہی حضورؐ نے قضاء کی ذمّے داریوں کا احساس ان معنی خیز الفاظ میں دلایا "جس شخص کو لوگوں کا قاضی بنا یا گیا، اسے گویا بغیر چھری کے ذبح کیا گیا!"

انصاف رسانی کے سلسلے میں حضورؐ کا فرمان ہے "قاضی کو چاہیے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنی ذاتی معلومات کو اس میں دخل نہ دے۔"

حاکم کی صفات

آں حضرتؐ طالب عہدہ لوگوں کو کبھی قاضی یا گورنر نہ بناتے تھے لیکن جسے عہدے کے لیے موزوں خیال فرماتے تھے، اس کی جرأت افزائی فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھ کو عامل بنا کر یمن بھیجا۔ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ آپ مجھ کو حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں۔ میں جوان ہوں اور حکومت کرنے کا طریقہ بھی مجھے معلوم نہیں۔"

آپؐ نے فرمایا "خدا تعالیٰ تیرے دل کی رہنمائی کرے گا اور تیری زبان کو ثابت رکھے گا"، پھر ارشاد ہوا "جب دو شخص کوئی معاملہ لے کر تیرے پاس آئیں تو پہلے شخص یعنی مدّعی کے حق میں اس وقت تک فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کے بیان کو سن لے، اس لیے کہ مدّعا علیہ کا بیان تجھے حکم دینے میں مدد دے گا۔"

ایک اور حدیث کے مطابق حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں فریق یعنی مدّعا علیہ اور مدّعی حاکم کے سامنے بیٹھیں (یعنی ان سے برابری کا سلوک ہو) حضورؐ کا قول ہے کہ اگر محض لوگوں کے دعوے پر ہی ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے لوگ اپنے آدمیوں کے خون اور مال کا دعوے (بغیر مستحکم بنیاد کے) کرنے لگیں گے۔ لہٰذا مدّعی پر قسم بھی ہے یعنی صرف مدّعی کا بیان کافی نہیں بلکہ مدّعی سے قسم لینا بھی ضروری ہے۔ بلکہ ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ثبوت مدّعی کے ذمّے ہے اور قسم مدّعا علیہ کے ذمّے ہے۔

حضرت اُمّ سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو، ممکن ہے تم میں سے کوئی شخص ایسا ہو جو اپنی دلیل کے ساتھ خوب تقریر کر سکے۔ پھر میں اس کے بیان کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو حقیقت میں اگر اس کا حق نہیں تو وہ اسے نہ لے۔ ایسی صورت میں گویا اس کے لیے دوزخ کی آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کرتا ہوں۔" یہ محض قانونیت پر انحصار کے خلاف تنبیہ ہے جب حق مدّعی کے ساتھ نہ ہو اس بارے میں خود فرد کے ضمیر کو قاضی بنا یا گیا ہے اور یہ امر اس پر دال ہے کہ اسلامی نظام قانون لادینی نظاموں کے برعکس، محض قانونی موشگافیوں کی بنا پر

یا قانونی حیلوں کے ذریعے کسی کو اپنی ذمّے داری سے سبک دوش نہیں کرنا۔ ہر فرد کو روحِ اسلامی کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا۔

مرافعہ کے علاوہ "استصواب" اور "تصحیح" کی مثالیں بھی عہدِ نبویؐ کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ جب کبھی حضورؐ کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرزِ عمل کی خبر ملتی تو آپ بصیغہ تصحیح دخل دہی فرماکر تلافی اور تدارک فرماتے۔ مسندِ احمد بن حنبل میں بھی آں حضرتؐ کے پاس مرافعوں کی نظیریں درج ہیں۔ نیز اس وثیقے سے جو حضورؐ نے قبیلہ بنو عبد القیس کو تحریر کرادیا، ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلوں پر نظرِ ثانی کا امکان بھی تھا۔ اس میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ مفصّل مقدمات میں ایسا عدل کریں کہ فریقینِ مقدمہ کو نظرِ ثانی کی ضرورت نہ رہے۔

کتمانِ شہادت اور جھوٹی گواہی کے خلاف کئی ایک حدیثوں میں شدید تنبیہ وارد ہے۔ خریم بن فاتک کہتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے ایک روز صبح کی نماز کے بعد کھڑے ہوکر تین مرتبہ فرمایا کہ جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے قل الحق ولو علیٰ نفسک (سچ بولو خواہ تمھارے اپنے خلاف ہو) عدلِ رسالت مآب کی اس سلسلے میں ایک مشہور روایت ہے۔ ابو لمعہ نے، جو انصار میں سے تھا، ایک زرہ چرائی اور اسے آٹے کی بوری میں رکھ لیا۔ بوری پھٹی ہوئی تھی اور اس لیے آٹا راستے میں اس کے گھر تک گرتا چلا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہی چور ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ زرہ اس نے ایک یہودی کے پاس امانت رکھ دی تھی اور پھر اپنی برادری کے لوگ حضورؐ سے خواہاں ہوئے کہ آپ انصاری کی عذر خواہی کریں۔ حضورؐ کو اشارۂ غیبی سے حقیقت کا پتا چل گیا اور آپؐ نے فیصلہ یہودی کے حق میں فرمایا۔ ابو لمعہ اس کے بعد مکّے کی طرف بھاگ کر چلا گیا اور اسلام سے مرتد ہوگیا۔

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے کالعدم تصوّر ہوگا۔ جب عمر بن حزم یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ان کو آں حضرتؐ نے ایک تحریری ہدایت نامہ عنایت فرمایا تھا۔ اس دستاویز میں منجملہ دیگر ہدایات کے، انھیں ہر معاملے میں اللہ کے امر کے مطابق صداقت کو مدِ نظر رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور ظلم و ستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یہ تفصیل بھی اس میں درج تھی کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجانہ دلایا جائے گا۔ نیز مختلف اجناس کے لیے بہ لحاظِ وسائل آب پاشی اور پالتو حیوانات پر زکوٰۃ کے پیمانوں کی صراحت کی گئی تھی۔

ربا کا قاعدہ سرمایہ داری نظام کی اساس ہے۔ ربا کی ممانعت قرآن مجید میں آئی ہے۔ اس ممانعت کے تحت حضورؐ نے ایک ہی جنس کی کم و بیش مقدار کا تبادلہ ممنوع قرار دیا تاکہ دھوکے، غلطی یا ربا کا امکان نہ رہے۔ صرف دست بدستی برابر برابر مقدار کے جنسی سودے کو جواز بخشا گیا۔ چناں چہ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ عمدہ قسم کی کھجور حضورؐ کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے لائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو صاع ناقص کھجوریں دے کر ایک صاع عمدہ کھجوریں خریدی گئی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "ایسا نہ کرو۔ اگر ضرورت ہو تو پہلے اپنی کھجوریں بیچ ڈال اور ان کی قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لے۔" صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے بغیر تلی یا غیر معیّن کھجوروں کے عوض فروخت سے منع فرمایا۔ اس اصول کے پیش نظر ایک سونے کے ہار کے متعلق ارشاد ہوا کہ اسے فروخت نہ کیا جائے، جب تک سونا اور نگینے علیحدہ علیحدہ نہ کر لیے جائیں۔

ابن ماجہ اور بیہقی کی روایت کے مطابق آں حضرتؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی کو قرض دے اور پھر قرض لینے والا اس کے پاس کوئی ہدیہ یا تحفہ بھیجے یا سواری کے لیے جانور دے تو وہ نہ تو سواری استعمال کرے اور نہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرے مگر اس صورت میں جب کہ قرض دینے سے پہلے بھی اس قسم کا معاملہ جاری ہو۔

صحیحین کی روایت ہے کہ اسی احتیاطی اصول کے پیش نظر حضورؐ نے مزابنہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کے تازہ پھلوں کو خشک پھلوں کے بدلے اس طرح فروخت کرے کہ خشک پھل کے پیمانے معیّن کرے اور تازہ پھلوں کا اندازہ کرے۔ اسی طرح محاقلہ یعنی کھڑی کھیتی کے بدلے معیّن مقدار غلہ کی فروخت کی ممانعت فرمائی۔ اس ضمن میں درختوں پر لگے پھلوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک ان میں پختگی کے آثار نمایاں نہ ہو جائیں۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا، کہ جب تک قبضہ میں لے کر، ناپ نہ لیا جائے، اسے فروخت نہ کیا کرو۔ عمومی طور پر حضورؐ نے غیر مقبوضہ اشیاء کی فروخت کے خلاف تنبیہ فرمائی۔ مگر بیع سلف کی ان شرائط پر اجازت دی کہ ناپ، وزن اور میعاد متعیّن ہوں۔ ملامست اور منابذت کی شکل میں بیع کی حرمت بھی اسی مصلحت کے تحت تھی کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں فروخت شدہ کپڑے کو کھول کر نہیں دیکھا جاتا بلکہ پہلی صورت میں بیع محض کپڑے کو چھو لینے سے اور دوسری صورت میں کپڑے کو ایک دوسرے کی طرف پھینک دینے سے مکمل ہو جاتی ہے۔ پوشیدہ عیب والی شے کی بیع کرنے والے کو حضورؐ نے غضبِ الٰہی

کا مورد قرار دیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، "مسلمان کے لیے دھوکہ دینا جائز نہیں"۔
بیوع کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر بائع اور مشتری میں اختلاف واقع ہو اور فروخت شدہ چیز بجنسبہ موجود ہو اور فریقین گواہ نہ رکھتے ہوں، تو بائع کا قول معتبر ہوگا اور فریقین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ رفع تنازعہ کی خاطر حضورؐ نے یہ صراحت فرمائی کہ بیع فسخ کرنے کا اختیار تا اختتام مجلس رہتا ہے اور بیچنے والے کو مجلس ختم کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اگر معاہدہ بیع کی شرط ہو کہ اختیار بعد میں بھی ہوگا تو دوسری بات ہے۔
احتکار یعنی گرانی کے خیال سے غلے کو روک رکھنے والے کو حضورؐ نے ملعون فرمایا۔ یہاں تک تنبیہہ کی گئی کہ اگر کسی نے چالیس دن غلے کو بند رکھنے کے بعد اسے خیرات بھی کر دیا کہ اسے ثواب نہ ہوگا۔

قرض کا لین دین

آں حضرتؐ نے قرض کی بوجہ احسن ادائیگی کی بار بار تاکید فرمائی۔ روایت ہے کہ ایک شخص اپنے اثاثے سے زائد قرضے چھوڑ مرا تو حضورؐ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھنے سے پرہیز کیا۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ خدا سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے مگر قرض کی معافی نہیں ہوتی۔ اس لیے مفلس قرض دار کا قرضہ معاف کر دینے یا کم از کم اسے مہلت دینے کی ترغیب متعدد احادیث میں وارد ہے۔ ایک شخص کے قرضے اس کے اثاثے سے متجاوز تھے، حضورؐ نے اثاثہ قرض خواہوں میں بہ حصہ رسدی تقسیم کر دینے کا حکم فرمایا۔ عصر جدید میں قانون دیوالیہ کے تحت بھی یہی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف قرض خواہوں کا تقاضا کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ ایک شخص نے آں حضرتؐ سے سختی کے ساتھ قرض کا تقاضا کیا۔ صحابہؓ اس کو دھمکانے یا مارنے کے ارادے سے اٹھے۔ حضورؐ نے فرمایا "اسے کچھ نہ کہو اس لیے کہ حق دار کو کہنے کا حق حاصل ہے"۔ پھر فرمایا "اونٹ خرید کر اسے دے دو"۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کے اونٹ سے بہتر اور زیادہ عمر کا ملتا ہے۔ فرمایا "وہی خرید کر دے دو۔ بہتر آدمی وہی ہے جو قرض کو خوبی کے ساتھ ادا کرے"۔

مدنیت کے اصولوں میں ایک اصول ہمیں احادیث میں ملتا ہے کہ جو شخص ایسی بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنائے جو کسی کی ملکیت نہ ہو وہ اسی کی ہے۔ ساتھ ہی کسی کی زمین پر ناحق قبضہ کرنے کے خلاف زبردست تہدید ملتی ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کسی قوم کی زمین بلا اجازت کاشت کرے تو اس کھیتی کی پیداوار کا وہ حق دار نہیں ہے لیکن جو خرچ اس نے کاشت پر کیا ہو، اس کے لینے کا مستحق ہے۔

ابوداؤد اور ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ۔ شفعہ کا حق ہمسایہ اور شریکِ ملکیت کے لیے احادیث میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ قریب کے رہنے والوں میں مغائرت یا منافرت پیدا نہ ہو۔ یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ مشترک ملکیت کی تقسیم کے بعد شریک کا حق قائم نہیں رہتا۔ رفاہِ عام کے لیے وقف کے احکام بھی ہمیں احادیث میں ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے کچھ زمین جس کا نام ثمغ تھا، حضرت عمرؓ کو عنایت فرما دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کچھ اور اراضی یہود سے خرید کر اس کے ساتھ شامل کر لی۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "میری جائیداد خوب ہے اور مجھے بہت پسند ہے"، حضورؐ نے فرمایا "اسے وقف کر دو اور اس طرح کہ اس کا اصل قائم رہے اور اس کی آمدنی خرچ کی جاسکے۔" حضرت عمرؓ نے اسی پر عمل کیا۔

قرآنی اجمال کی رسالتی سطح پر تفصیل کی مثالیں ہمیں قانونِ میراث میں ملتی ہیں۔ آیۂ میراث کا حکم عام ہے۔ حضورؐ کے ارشادات سے والدین اور اولاد کے مفہوم کی تخصیص ہوئی۔ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دوسرے سے میراث پانے والے ایک ہی دین پر ہونے چاہئیں۔ آپؐ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے کہ قاتل مقتول کے مال کا وارث نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں بظاہر وصیت کے متعلق عام حکم ہے۔ حضورؐ نے آیۂ میراث کے پیشِ نظر صراحت فرمائی ہے کہ وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ تمام ورثاء رضا مند ہوں۔ لا وصیۃ للوارث۔ پھر آپؐ نے وصیت کی تحدید ایک تہائی جائیداد تک فرمائی۔ حضرت سعد بن وقاصؓ فتح مکہ کے سال میں بیمار ہوئے اور انھوں نے آں حضرتؐ سے استفسار کیا کہ کتنے مال کی وصیت کر دیں۔ حضورؐ نے ایک تہائی کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ ارشاد ہوا کہ اگر تو اپنے وارثوں کو مال دار اور خوش حال چھوڑے گا، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تو ان کو مفلس چھوڑے اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔

اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وصیت کے احکام کی صورت آیۂ میراث کے نزول کے بعد بدل گئی۔ نیز حضورؐ نے توضیح فرمائی کہ وصیت اور تقسیم میراث پر قرض کی ادائگی مقدم ہے حالاں کہ آیۂ قرآنی کے الفاظ ہیں "من بعد وصیۃ توصون بھا او دین" بظاہر ان الفاظ سے قیاس ہو سکتا تھا کہ وصیت کا ذکر چوں کہ پہلے آیا ہے۔ اس لیے اسے

دَین یعنی قرضے پر بھی فوقیت ہو گی۔
اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کچھ رشتے حرام فرمائے ہیں مثلاً ماں، بیٹی، بہن یا دو بہنوں کا عقد میں جمع کرنا وغیرہ۔ ان کے علاوہ باقی رشتوں کو آیتِ قرآنی میں حلال بیان کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا فیصلہ تھا کہ بیک وقت پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی سے بھی نکاح نہ کیا جائے کہ اس طرح خطرہ ہے کہ ان کے درمیان صلۂ رحمی اور محبّت قایم نہ رہ سکے۔
عورتوں کے حقوق کے بارے میں متعدد احادیث میں تذکرہ ملتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا "بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے، جب تک اس سے اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔ اور کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے، جب تک اس سے دریافت نہ کر لیا جائے۔"
حضورؐ نے فرمایا کنواری کی خاموشی ہی رضامندی کے مترادف سمجھی جائے۔ گویا قرآن کی شہادت کا جواز اس حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور دارمی نے ابو موسیٰ سے روایت کی ہے کہ اگر کنواری انکار کرے تو اس پر جبر جائز نہیں۔ چناں چہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک کنواری لڑکی نے بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باپ نے میری رضامندی کے بغیر میرا نکاح کر دیا ہے۔ آپؐ نے اس کو چھوڑ دینے کا اختیار دیا۔
حضورؐ نے خلع کا حق ثابت بن قیس کی بیوی کو دلوایا۔ اور فیصلہ محض اس کی ذاتی نفرت کی بنا پر دیا۔ شرط یہ رکھی گئی کہ مہر میں جو باغ اسے شوہر نے دیا تھا، وہ شوہر کو واپس کر دے۔
ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عورت کو معاشرے میں اس کا جائز مقام دلوایا۔
اسی ضمن میں غالباً شعار کی ممانعت بھی آتی ہے۔ شعار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ بدلے کے طور پر کر دے گا۔ اور دونوں نکاحوں میں مہر کچھ نہ ہو گا۔ اس میں قباحت یہی ہے کہ لڑکیوں کی رضامندی کا حق بالائے طاق رہ جائے گا۔
طلاق کی صورت میں حضانت کا حق حضورؐ نے صغر سِن بچّوں کی ماں کو دلوایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ آں حضرتؐ نے ایک لڑکے کو اس امر کا اختیار دیا کہ وہ ماں کے پاس رہے یا باپ کے پاس۔ ان فیصلوں میں بچّوں کی صحیح تربیت اور مناسب نشو و نما کا نکتہ پوشیدہ ہے۔

عہدِ عتیق میں قانونِ حمورابی کے مطابق کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جاتا تھا اور اصلی قاتل محفوظ رہتا تھا۔ قانونِ حمورابی کے بعد اس کے قانونِ قصاص کا ذکر ہے۔ آں حضرتؐ کے عہدِ معدلت گستری میں قتلِ عمد، مشابہ عمد اور قتلِ خطاء میں فرق کیا جانے لگا۔ اس تفریق کا ذکر حضورؐ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی ملتا ہے۔ قتلِ عمد کے لیے قصاص کا حکم ہوا، الّا یہ کہ وارث خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں یا معاف کر دیں۔ شبہ عمد کی صورت میں حضورؐ نے دیت مقرر فرمائی۔

ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قاتل کے ہاتھ نے عمداً فعل کیا ہے اور اس کے دل نے خطا۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اگر قاتل کے ہاتھوں بلا ارادہ یا نیت کے قتل ہو جائے تو پھر مارنے والے کا قاتل دوزخ کا مستحق ہوگا۔ آیت ربّانی "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" کے موافق، شخصی ذمّے داری کا اصول آں حضرتؐ کے زمانے میں قایم ہوا۔ زمانۂ جاہلیت میں ایسی نظیریں ملتی ہیں کہ کسی طاقت ور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے دگنا ہوتا۔

ابنِ ہشام نے اپنی سیرت میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتے دار کا سر مانگا جاتا۔ کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کم تر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا تھا۔ آں حضرتؐ کے حکم سے ایک آزاد آدمی بھی ایک غلام کے قتل کے لیے واجب القتل ٹھہرا۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا وہ سب مسلمان قصاص اور دیت میں برابر ہیں "کُلُّ مؤمنٍ اِخوۃٌ" کی یہ عملی تشکیل تھی۔ حضورؐ نے فعل کی نوعیت کے لحاظ سے سزا میں بھی تفریق کی۔ ایک شخص کو جس نے مقتول کو پکڑ رکھا تا آں کہ قاتل نے اسے مار ڈالا حضورؐ نے اسے تا عمر قید کی سزا دی اور قاتل کو قتل کرا دیا گیا۔

حضورؐ نے بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی TORT کا اصول قایم فرمایا اور ہرجے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دیا جانے لگا۔ غیر جانب دارانہ قانونی انصاف کے ساتھ رحم کے تقاضے بھی نظر انداز نہ ہوتے۔ حضورؐ نے ضرب یا جراحت کی دیت کے پیمانے مقرر فرمائے۔ لیکن رحمت للعالمینؐ کی شان یہ تھی کہ کمزوروں اور ناداروں سے مروّت اور

فیاضی کا سلوک ہوتا تھا۔ ابن حصین روایت کرتے ہیں کہ ایک نادار و مفلس طبقے کے لڑکے نے ایک دولت مند خاندان کے لڑکے کا کان کاٹ ڈالا۔ مفلس طبقے کی جماعت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا "ہم تو فقیر لوگ ہیں۔ دیت کی استطاعت نہیں رکھتے۔" حضورؐ نے ان کو معاف فرمادیا۔

حالات و واقعات کے لحاظ سے مناسب رعایت روا رکھی جاتی تھی۔ ایک اپاہج اور بیمار شخص، جس نے قبیلے کی ایک لونڈی سے زنا کیا تھا، حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضورؐ کے حکم سے اسے کھجور کی ایک ٹہنی سے جس میں چھوٹی چھوٹی سو شاخیں تھیں۔ ایک ہی ضرب لگائی گئی اور یوں "مأة جلدة" کا لفظی تقاضا پورا کیا گیا۔ کیوں کہ احتمال تھا کہ وہ کوڑوں کی سزا سے مرجائے گا۔ سفر یا جنگ کے حالات میں چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا سے احتراز کیا گیا۔ حضورؐ کا فرمان ہے: "لا تقطع الایدی فی السفر" اور ایک روایت میں "سفر" کی بجائے "غزوہ" کا لفظ ہے۔ ایک شخص کے غلام نے اس کی بیوی کا آئینہ چرا لیا۔ غلام کو حضورؐ نے سزا دی۔ عباد بن شرجیل کے سرقے کا واقعہ بھی حدیث میں مذکور ہے۔ انھوں نے کسی کے کھیت میں گھس کر وہاں سے کچھ غلّہ توڑ کر کھا لیا۔ اور کچھ اپنے کپڑے میں باندھ لیا۔ اتنے میں مالک آن پہنچا۔ اس نے اسے مارا اور کپڑا بھی چھین لیا۔ اور حضورؐ کے پاس ان کو لے گیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نادان تھا تو تم نے اسے سمجھایا نہیں اور بھوکا تھا تو کھلایا نہیں۔ یہ سن کر مالک نے اسے کپڑا بھی واپس کر دیا اور نصف وسق غلّہ بھی دے دیا۔

امتحانی آزادی

میری ناچیز رائے میں اس روایت سے پہلے جرم پر محض فہمائش یا امتحانی آزادی PROBATION کے جواز کا قیاس ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کو جس نے کھانے کی چیز کی چوری کی تھی حضورؐ نے سزا نہیں دلوائی۔ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں اور سفید کھجوروں کے سرقے پر بھی حضورؐ نے قطع ید سے منع فرمایا۔ ایک غلام کو جو عادی چور تھا، حضورؐ نے چار مرتبہ معاف فرمایا دیا۔ اور بعد کے جرائم پر سزا دلوائی۔

آں حضرتؐ کی حدیث ہے "لاضرر ولاضرار" یعنی شریعت کا مطمح نظر کسی فریق مقدمہ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اسلامی فقہ میں استحسان مصالح مرسلہ کی قسم

کے اصولوں کی بنیاد اس قولِ نبویؐ سے مناسبت رکھتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کسی کو تنبیہہ یا تعزیر کے طور پر مارنا ہو تو خطا کار کے منھ پر نہیں مارنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فعل، شرفِ انسانی کے خلاف ہے۔ شرابی کو بعض روایات کے مطابق حضورؐ نے معمولی مارپیٹ کی سزا دی اور بعض حالتوں میں کوڑے بھی لگوائے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور خمر حرام ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں کوئی گڑھا یا کوئی جانور اگر کسی آدمی کی مضرت یا ہلاکت کا باعث ہوتا تو سزاوارِ عقوبت قرار دیا جاتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک انگلستان میں بھی کسی گاڑی، درخت یا دیگر کسی جاندار نا قابل کو قانوناً سزائے قتل دی جاتی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بے زبان جانور، کان اور کنوئیں کی ضرر رسانی سے کوئی ذمے داری پیدا نہیں ہوتی۔

جان و مال کی حفاظت کا حق متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ ان کا ایک نوکر ایک دوسرے آدمی سے لڑ پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ ان میں سے ایک نے جب اپنا ہاتھ دوسرے کے منھ سے زور سے کھینچ کر نکالا تو اس کے دانت گر پڑے۔ اس نے حضورؐ سے استدعا کی کہ دانتوں کا معاوضہ دلوائیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا وہ اپنے ہاتھ کو تیرے منھ میں چھوڑ دیتا کہ تو اس کو اونٹ کی طرح چبا ڈالتا؟"

ایک اور حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے تو اسے شہید کا درجہ حاصل ہوگا۔ اور اگر وہ غاصب کو ایسی حفاظتی لڑائی میں مار ڈالے تو اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی راوی نے آں حضرتؐ کا قول روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا اجازت تیرے گھر میں جھانکے اور تو اسے کنکری مارے جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔ یوں ذاتی تخلیہ یا "PRIVACY" کا حق حضورؐ نے تسلیم فرمایا۔

کوئی امتیاز نہیں

حضورؐ نے واضح فرما دیا کہ حدود کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ "تم سے پہلی امتیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے جب کوئی عزت والا چوری کرتا تھا تو اسے سزا نہ دیتے تھے۔ قسم ہے خدا

کی اگر فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں۔" اس خطبے کا ذکر بخاری اور مسلم دونوں نے کیا ہے۔

رسولِ مقبولؐ کے زیرِ ہدایت شک کا فائدہ ملزم کو دیا جانے لگا۔ آپؐ کا قول ہے۔ "ادرؤا بالشبہات" یعنی شبہات کی موجودگی میں سزاؤں سے درگزر کرو۔" اس قول کا حوالہ ابنِ رشد نے ہدایۃ المجتہد میں دیا ہے اور اس کی روایت ترمذی میں بھی موجود ہے۔ حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کا فرمان مروی ہے کہ مسلمان سے جہاں تک ہو حدود کو دور کرو اور اگر ذرا سا موقع بچاؤ کا نکل آئے اسے چھوڑ دو۔ ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا "فان الامام ان یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبۃ" یعنی معافی دینے میں خطا کرنا بہتر ہے بہ نسبت سزا دینے میں غلطی کرنے سے۔

حضرت اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کے لوگوں کے مقابلے میں آں حضرتؐ نے ہم کو بھیجا۔ میں ایک شخص کے مقابلے پر آیا اور اس پر نیزہ سے حملہ کرنا چاہا تھا کہ اس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا۔ میں نے اس کو نیزے سے مار ڈالا اور بارگاہ نبوتؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا، آپؐ نے فرمایا جب اس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تھا تو پھر تو نے اسے کیوں قتل کر دیا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس نے تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا، تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟ حضورؐ نے ایک اور مرتبہ فرمایا:

"نحن نحکم بالظاھر واللہ یتولی السرائر" یعنی ہم ظاہر پر فیصلہ کرتے ہیں (جہاں نیت نہ معلوم ہو سکے) اور نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ ظاہر واقعات اور قرائن پر انحصار کا اصول ایک اور مخاصمے سے روشن ہوتا ہے۔ جو حضورؐ نے فیصلہ فرمایا۔ ایک جانور کی ملکیت کے متضاد زبانی دعوؤں کی صورت میں حضورؐ نے فیصلہ اس شخص کے حق میں کیا جس کے قبضے میں وہ جانور تھا۔ جدید اصولِ قانون کا مقولہ بھی یہی ہے کہ قبضہ قانون کا ۱۰/۹ حصہ ہے۔

قتل کے مقدمات میں عدم شہادت کی صورت میں حضورؐ نے قسامت یعنی جماعتی قسم کا قاعدہ استعمال فرمایا۔ اور جہاں فریقین میں سے کوئی جماعت قسم کھانے کو تیار نہ ہوئی تو حضورؐ نے دیت بیت المال سے دلوا دی۔

بعض نظیروں سے مترشح ہے کہ حضورؐ نے فوج داری نوعیت کے مقدموں میں ملزم

کو تحقیقات تک ادر ملیہ لون کو قرض کی ادائی کے لیے حوالات میں محبوس رکھا۔ اس قسم کی ایک روایت سنن ابوداؤد میں شامل ہے۔ صاحب مبسوط رضؓ نے اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ عہد نبویؐ میں بعض اوقات حاضری کا مچلکہ بھی لیا جاتا تھا۔

مغربی قانون فلسفہ کا ایک اصول یہ ہے کہ صدر ریاست دولتی عدالتوں میں جواب دہ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام میں کسی فرد کو خواہ وہ ریاست کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو قانون سے بالا نہیں سمجھا جاتا۔ خود رسول اکرمؐ نے اپنی ذات کے خلاف خمان یعنی ٹارٹ اور دیوانی، دونوں قسم کے دعوے سن کر مدّعیوں کے حق میں فیصلے دیے۔ اس قسم کے فیصلے قانون کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں ان ہی نظیروں کی وجہ سے عہد خلافت راشدہ میں خلیفۂ وقت کو بھی قاضی ایک معمولی فریق مقدمے کی حیثیت سے طلب کر لیتا تھا۔ اور اسے حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ قضاء کی اہمیت حضورؐ کے ایک اور قول سے بھی واضح ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ دو فریقوں کے کسی جھگڑے کا عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا صدقہ ہے۔

شہادت کی پرکھ کی نسبت حضورؐ کا ارشاد ہے کہ خائن مرد اور خائن عورت زانی مرد اور زانیہ عورت کی شہادت قبول نہیں ہو سکتی۔ جو شخص کسی کی نسبت دل میں کینہ رکھتا ہے۔ یا کھانے پینے میں کسی کا طفیلی ہے، اس کی شہادت بھی اس کے حق میں جس کا وہ طفیلی ہے، قابل پذیرائی نہیں۔ حضورؐ کی یہ بھی سنت ہے کہ جب شہادت کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہو تو گواہوں کا تزکیہ کیا جائے۔ مقدمے بازی کو حضورؐ نے عمومی طور پر مذموم قرار دیا۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جھگڑالو اور مقدمے باز شخص کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ خدائے پاک کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب ہے۔" بعض مقدمات میں حضورؐ نے فقط ایک گواہ کی شہادت پر بھی فیصلہ فرمایا۔ بہ شرطیکہ حلف اس کے ساتھ ہی شامل ہو۔

نفع یا نقصان کے اثبات یا نفی کا پیمانہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق عرفِ عام ہے۔ اس کی مثال براء بن عازب کا مقدمہ ہے۔ اس کی اونٹنی کسی کے باغ میں گھس گئی اور اس کو خراب کر ڈالا۔ باغ کا مالک اور صاحب شتر دونوں اپنے آپ کو معذور یا حق بجانب سمجھتے تھے۔ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ دن کے وقت کھیت اور باغ کے مالکوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کریں۔ مال مویشی کے مالکوں پر اس کی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ برخلاف

اس کے رات کے وقت مویشی کے مالکوں کا فرض ہے کہ ان کو سنبھالے رکھیں۔

ایک بنیادی جامع بالغ اصول حضورؐ نے "الخراج بالضمان" کہہ کر قائم فرمایا یعنی کسی چیز کے حاصل یا پیداوار کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو اس کے وجود اور بقا کا ذمے دار ہے دوسرے لفظوں میں جو شخص کسی چیز کا تاوان برداشت کرتا ہے اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہے۔

معاہدات کے متعلق حضورؐ نے یہ کلیہ بیان فرمایا کہ مسلمانوں نے آپس میں جن شرطوں کا التزام کیا ہو، ان کی پابندی لازمی ہے اِلّا یہ کہ انھوں نے کوئی شرط عائد کی ہو جس کی وجہ سے حرام حلال ہو جائے۔ یا حلال کو حرام سمجھنا پڑے۔

بعض خصومات میں تصفیے کے لیے ماہرین کی امداد حاصل کرنے کی مثالیں بھی عہدِ نبویؐ سے ملتی ہیں۔ تعمیرات، غلے یا دیگر زرعی پیداوار کا اندازہ کرنے کے لیے آں حضرتؐ نے ماہر، بر سرِ موقع تفتیش کے لیے، مامور فرمائے۔ قیافہ شناس کی بشارت بطورِ قرائن کے مقبول کیے جانے کی نظیر بھی تاریخ عہدِ نبویؐ میں مذکور ہے۔

نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقعے پر (۱۰ ہجری) جبل الرحمۃ کے مشہور خطبے میں جو تصریحات فرمائیں تاریخ میں منشورِ انسانیت کی مترادف ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کے بنیادی حقوق یعنی جان، مال، آبرو محفوظ اور قابلِ احترام ہیں۔ امانت کی واپسی اور قرض کی ادائی فرائض میں شامل ہے۔ ربا لینے یا دینے کی قطعی ممانعت کی گئی اور ارشاد ہوا کہ قرض خواہ کو صرف اصل رقم واپس ہوگی۔ قتلِ عمد کے لیے قصاص اور شبہ عمد کے لیے دیت ہوگی۔ زوجین کے ایک دوسرے پر حقوق کی صراحت کی گئی۔ کسی کا مال غصب کرنے اور کسی مسلمان بھائی سے لڑائی کے خلاف سخت تہدید کی گئی۔ احترامِ فرد کا معیار، نسل و رنگ کی اضافی قدروں کے بجائے اتقا یعنی خوفِ خدا قرار دیا گیا، وراثت میں قرآنی حصص کی پابندی کی تاکید ہوئی اور وصیت کی تہائی مال تک تحدید کی گئی۔

ہم نے بحرِ سنتِ نبویؐ کی غواصی کر کے چند دُرِ آب دار آپؐ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ حضورؐ کے قول، فعل اور تقریر میں کئی مسائل پر ہمیں رہنمائی مل سکتی ہے لیکن یہ مقالہ ان سب کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

بہ ہر صورت جو نظیریں میں نے عرض کی ہیں ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلامی نظام جس کی داغ بیل حضور رسالت مآب نے ڈالی تھی قانون کا احترام محض جسمانی یا مالی مواخذے کے خوف سے وابستہ نہیں کرتا بلکہ افراد اور جماعتوں کے اخلاقی شعور کو بیدار کر کے ایک ایسا نصب العین ان کے سامنے رکھتا ہے جس کے زیر اثر قانون کے تقاضوں سے گریز یا فرار کی کم سے کم گنجائش رہے اور افراد اسلامی قانون کی بالادستی بہ طیبِ خاطر قبول کر لیں۔ یہ گویا ان کا دینی فریضہ ہے کہ قانون کے تقدس کو قایم رکھیں۔ اس طریقِ کار سے نظامِ ربوبیت انسانی معاشرے میں تشکیل پا سکتا ہے تاکہ نیابتِ الٰہی کے تقاضے پورے ہوں۔ یہ حضور ہی کا فیض ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا نظامِ شریعت موجود ہے جس کی تحسین اعلام الموقعین میں ابنِ قیم نے ان الفاظ میں کی ہے :-

"شریعت کی اساس و بنیاد حکمت پر اور بندوں کے معاشی و معادی مفادات پر قایم ہے۔ شریعت کلیتہً عدل، ہمہ تن رحمت اور سراپا حکمت ہے۔ پس جو مسئلہ بھی عدل سے نکل کر ظلم کی طرف یا رحمت سے عدم رحمت کی طرف یا صلاح سے فساد کی طرف جا رہا ہو وہ شریعت ہی نہیں اگرچہ اسے بہ دلائل داخلِ شریعت کر دیا گیا ہو۔

شامِ ہمدرد، لاہور
جمعرات، ۷ مئی ۱۹۷۰ئش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
نمونۂ کامل

جناب جسٹس سجاد احمد جان صاحب
جج، سپریم کورٹ آف پاکستان

کئی برس ہوئے ایک قوال سے حضرت سید مہر علی شاہ صاحب مرحوم کے پٹھواری زبان میں نعتیہ اشعار سننے کا اتفاق ہُوا۔ اُن کا ایک شعر کچھ اس طرح دل میں اُتر گیا کہ جب کبھی رسول مقبول صلعم کا ذکر زبان پر آتا ہے وہ شعر بھی یاد آجاتا ہے۔ اور اس مرتبہ بھی جب میں نے یہ عقیدت نامہ لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو وہ شعر فوراً ذہن میں اُبھر آیا۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھاں کتھے جا لڑیاں

حضرت سعدی علیہ الرحمۃ بھی غالباً ایسی ہی مشکل میں تھے، جب یہ شعر ان کی زبان سے نکلا تھا ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی ست

ایک ایسا انسان جس کی زندگی عطر کی طرح تمام انسانی خوبیوں کا مجموعہ ہو، جس کی طینت، اخلاق و کردار میں اس پاکیزگی کا سراپا مرقع ہو اس کے بارے میں گفت گو

کے لیے پاکیزگی دل اور پاکیزگی زبان کی ضرورت ہے۔ گناہوں سے لدے ہوئے مجھ ایسے انسان کے لیے یہ جسارت اپنی شرمندگی کو ڈھانپ کر محض اس اُمید پر ہی ہو سکتی ہے کہ اُس ذاتِ پاک کے بیان سے شاید میرے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اس کے پاک ذکر کی لذّت سے شاید میرے دل اور میری زبان کی کثافت کے دُھل جانے میں مدد مل سکے۔ تاریخ عالم میں بڑے بڑے مشاہیر گزرے ہیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان میں دنیوی اور روحانی رہنما دونوں شامل ہیں۔ ان میں سے ایسے بھی ہیں، جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث اپنے مخصوص مشن کو درجۂ کمال تک پہنچا کر انسانی متاعِ حیات میں اضافہ کیا ہے۔ شہرۂ آفاق مدبّر، جابر سلاطین، بلند پایہ فلسفی اور مفکّر، سیاست داں اور سائنس داں، ماہرینِ اقتصادیات اور معاشیات، بڑے بڑے سپہ سالار اور عالی دماغ مصنّفین جنھوں نے اپنے اپنے طور پر تاریخ کے رُخ کو موڑا ہے اور انسان کو شاہراہِ ترقی پر گام زن کرنے میں قابلِ قدر خدمات سر انجام دی ہیں، ان میں روحانی پیشوا اور انبیاء شامل ہیں، جنھوں نے معرفت کی منازل طے کر کے اپنے پیغام کے ذریعے اپنی قوموں اور اپنے لوگوں کے لیے راہِ نجات کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن سردارِ دوجہاں صلعم کی ذاتِ گرامی میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں، جو انھیں ان سب سے ممتاز اور ممیّز بنا دیتی ہیں۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے شرفِ انسانیّت اور احترامِ آدمیّت کو جس بلند مقام پر پہنچایا ہے۔ دیگر سب کی مشترکہ سعی عمل اُس مقام کو حاصل کرنے میں قاصر رہی ہے۔ اس طرح بندہ اور خالقِ حقیقی کے رشتے کی استواری اور مضبوطی میں عبدیّت کی صحیح منزل اور اس کے راستوں کی نشان دہی اور ہمواری میں بنی نوعِ انسان کی سربلندی کے لیے انسانیت کی جو خدمت حضور صلعم نے سر انجام دی ہے وہ باقی سب کی مجموعی کاوشوں سے کہیں زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ حضور کی زندگی کھُلی کتاب کی طرح ہے جس کا ہر ورق بلکہ جس کی ہر سطر تاریخی حقائق اور سندات پر مبنی ہے یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ جس تفصیلی اور مستند واقعہ نگاری کے ساتھ رسولِ اکرم کی سوانح حیات کو قلم بند کیا گیا ہے، اس کی مثال کسی اور رہبر یا پیغمبر کی رودادِ حیات میں نہیں ملتی۔ پیدائش سے لے کر

طبعی عمر کے آخری سانس تک آپؐ کا ہر ایک کلمہ، آپؐ کا ہر قول و فعل، زندگی کا ہر گوشہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے اقوال کے علاوہ جو حضورؐ کی ہر بات اور ہر عمل کو اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت سمجھتے تھے، حضورؐ کی سوانح کے متعلق متقدمین کی مسلسل تحقیق کا بے بہا خزانہ موجود ہے۔ یورپین مصنفین نے بھی حضورؐ کے حالاتِ زندگی لکھنے میں بھرپور حصّہ لیا ہے۔ علّامہ شبلی مرحوم نے اپنے وقت میں ان کی تعداد سترہ انگلستانی، ستر فرانسیسی، آٹھ جرمن اور پانچ دیگر اقوام کے افراد بتائے ہیں، جنھوں نے اپنے تعصّب زدہ ذہنوں سے واقعات کو مروڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کسی کو یہ توفیق نہیں ہو سکی کہ وہ حضورؐ کے پیغام و عمل میں کوئی تفاوت بیان کر سکے۔

یہ حضورؐ کی زندگی کا خصوصی اعجاز ہے کہ آپؐ کا پیغام اور آپ کی تعلیم کسی ایک فرد یا کسی ایک قوم کے لیے محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ کون و مکان کی قید سے آزاد ایک مکمّل ضابطۂ حیات کی صورت میں ہر دَور اور ہر زمانے میں تمام بنی نوع انسان کے لیے ان کی فلاح و بہبود اور نجات دہی کے داعی ہیں۔ ان کا پیغام، اُن کی تعلیم اور اُن کا عمل موتیوں کی طرح ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، جن کا ماخذ اور جن کی سب سے بڑی شرح وہ الہامی کتاب ہے، جس کی عصمت اور صداقت کی حفاظت کو خالقِ حقیقی نے خود اپنے ذمّہ لے لیا ہے:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵ : ۹)

اس خدائی حفاظت کا ایک پہلو ملاحظہ کیجیے۔ کسی آسمانی صحیفے کو یہ سعادت نصیب نہیں کہ وہ لاکھوں سینوں میں محفوظ اور اس طرح از بر یاد ہو جیسے کہ قرآنِ حکیم ہے جس میں ابتدائے نزول سے اب تک نہ کوئی ترمیم ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے یورپ کے معاند محقّقین نے بھی تسلیم کیا ہے۔

قرآن کریم رسول اکرمؐ کی اس ہمہ رس رسالت اور ہمہ گیر پیغام کا اعلان یوں فرمایا ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۝

رکہہ دو کہ میں اللہ کی جانب سے تمام بنی نوع انسان کے لیے رسول بن کر

آیا ہوں ۔"

پھر ارشاد ہوتا ہے :

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

(ہم نے تمھیں سب جہانوں کے لیے رحمت کے طور پر بھیجا ہے)۔

ظاہر ہے کہ باری تعالیٰ کے اِن اعلانات کی صداقت کا انحصار اس بات پر ہے۔ کہ یہ جس دینِ کامل اور جس سرچشمۂ رحمت پیغمبر سے متعلق ہیں۔ کیا وہ ان اعلانات کی جامعیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایک دین اُسی صورت میں کامل کہلائے جانے کا مستحق ہے کہ جب اُس میں انسان کو معراج انسانیت پر لے جانے کے لیے رہنمائی کی پوری صلاحیتیں موجود ہوں اور اس کا حامل اسی صورت میں سب جہانوں کے لیے سرچشمۂ رحمت بن سکتا ہے جب کہ اس نے خود اپنے عمل اور کردار سے معراج انسانیت کی منزل کو حاصل کر لیا ہو۔ اور دوسروں کے لیے ایک نمونۂ کامل بن کر اس کے حصول کے راستے ہموار کر دیے ہوں۔

یہ حضورؐ کی زندگی کا ایک اور اعجاز ہے کہ اُن کا پیغام یعنی اُن کا پیش کردہ دین اور ان کا عمل ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیے جا سکتے۔ جس نظامِ زندگی کا اُنھوں نے پیغام دیا تھا آپ نے اپنے عمل سے اس کی پذیرائی اور عملی قوّتِ استعداد کو ثابت کر دیا۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اُن کی سیرت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ تو انھوں نے ایک فقرے میں جواب دے دیا کہ اُن کی سیرت قرآن ہے۔ یعنی اُن کا عمل قرآن کی تعلیم اور فرمودات کے مطابق تھا اور قرآن کریم کی تعلیم وہی کچھ ہے جو رسولِ خدا کا عمل تھا۔ چناں چہ قرآن میں ارشاد ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔

(تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے)

حکمتِ ایزدی دیکھیے کہ اس سرچشمۂ رحمت کو زندگی کے ان تمام گوناگوں مراحل سے گزرنا پڑا جن کا کسی ایک انسانی زندگی میں یکجا مجتمع ہونا امر محال ہے۔ دنیا میں جو بھی کیفیت کسی ایک انسان پر گزر سکتی ہے۔ اُس سے رسولِ مقبول کو دوچار ہونا پڑا اور انھوں نے اپنے عمل سے اُس کیفیت سے نپٹنے کی مثال قائم کی ہے۔

یہ بات بجائے خود اُن کے نمونۂ کامل ہونے کی ایک روشن دلیل ہے کہ دنیا میں جب آنکھ کھولی تو یتیم ہو گئے، دادا اور چچا کی شفقت نے سنبھالا دیا جسے اُنھوں نے اپنے حُسنِ کردار سے سینچا۔ جوانی ایسے معاشرے میں بسر کی جو شرفِ انسانیت کی تمام خوبیوں سے نابلد اور سراسر برائیوں میں سرشار تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی عِصمت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر آنچ نہ آنے دی۔ اسی معاشرے نے انھیں صدّیق اور امین کا خطاب دیا۔ خدا کی وحدانیت کے اعلان پر مصائب میں مبتلا کر دیئے گئے۔ دشمن ان کی جان کے درپے تھے لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو اُن کی دیانت اور راست بازی کے متعلق زبان پر حرف لا سکتا۔ کاروانِ حیات کو سبھی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ غریبی، امیری، محکومی، شہنشاہی، میدانِ جنگ، امورِ سلطنت، یعنی زندگی کی ہر ایک کیفیت سے مکمّل طور پر واسطہ پڑا۔ لیکن ہر کیفیت میں، ہر مقام اور ہر مرحلے پر انھوں نے انسانیت کے اعلاترین اقدار کی ایسی خوب صورت مثالیں اور میٹھی یادگاریں چھوڑی ہیں، جنھیں فخر و مباہات سے دہرایا جا سکتا ہے۔

ایک انگریز مصنّف باسورتھ سمتھ نے اپنی کتاب MOHAMMAD & MOHAMMADAN میں حضور صلعم کی ان مختلف اور متضاد کیفیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھّا ہے کہ

"جب ہم آپ کی مختلف حالتوں پر نظر ڈالتے ہیں بلحاظ صحرا کے ایک گلّہ بان کے، یا شام کے ایک تاجر کے، غارِ حرا میں ایک خلوت نشین کے یا مدینے میں ایک جلا وطن کے اور یا پھر ایک عظیم فاتح اور قیصر و کسریٰ کے ہم پلّا ہونے کے، تو نظر یہ آتا ہے کہ ان تمام مختلف حالتوں میں آپ ایک ہی روش پر قائم ہیں۔ کوئی ایسا اور شخص مشکل سے نظر آئے گا جس کے گردو پیش کے حالات میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے لیکن اس کے دل کی کیفیت میں سرمُو کوئی فرق نہ آنے پائے۔ وہ ریاست اور مذہب دونوں کے سربراہ بنے یعنی بیک وقت قیصر بھی اور پوپ بھی۔ لیکن آں میں پوپ کی ظاہری سج دھج تھی نہ ان کے پاس قیصر کی سپاہ اور شان و شوکت۔ نہ کوئی محل تھا نہ آسائش، نہ معیشت کا سر و سامان، لیکن اگر کسی انسان کو

فی الحقیقت دلوں پر حکومت کرنے کا استحقاق نصیب ہوا ہے تو وہ محمدؐ عربی کی ذات تھی جنھیں اقتدارِ مطلق حاصل تھا۔ لیکن ان کے ظاہری وسائل اور مادّی سہارے مفقود تھے"۔

خوشتر آں باشد کہ سِرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

قرآن حکیم نے ایک مردِ مومن اور مردِ کامل کا تصوّر پیش کیا ہے، جو اپنی تخلیق کے راز سے آشنا اپنی صلاحیتوں سے بہرہ اندوز، خود آگاہی کی منازل طے کر کے فطرت کے سینے میں سربستہ رازوں کو چیرتے ہوئے خالقِ حقیقی کی آغوش میں اپنے لیے وہ مقام حاصل کر لیتا ہے، جہاں بقولِ حکیم الامّت علّامہ اقبال ؎

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

رسولِ مقبول کی زندگی اس مردِ مومن اور مردِ کامل کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ایک عملی نمونہ جس نے ہر سطح اور مقام پر انسانیت کی اعلا ترین اقدار اور مدارج کو قائم رکھا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ضابطوں کی تدوین اور تکمیل کے لیے شاہراہیں ہموار کیں اور اُن شاہراہوں پر اپنے عمل اور اپنے کردار سے ایسے روشن مینار قائم کیے جو اہلِ بصیرت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ شمعِ ہدایت بنے رہیں گے۔

اس مختصر صحبت میں حضورؐ کی زندگی اور اُن کے کردار کے کسی ایک پہلو پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنی ممکن نہیں۔ میں صرف اس گزارش پر اکتفا کرتا ہوں کہ حضورؐ نے اپنی زندگی میں عملی طور پر اپنے پیغام اور اپنی تعلیم کی حقانیت کو ثابت کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ انسان تمام دشواریوں اور مشکلات کے باوجود صالح اور پاک زندگی بسر کرنے پر قادر ہے۔ عزم اور استقلال کے ساتھ اپنی منزل کو حاصل کر سکتا ہے۔ انھوں نے ایک عام بشر کی حیثیت سے اپنی مختلف ذمّے داریوں سے خوب صورتی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی مثال قائم کی ہے جو ایک بے کس مظلوم شہری سے شروع ہو کر سربراہِ سلطنت اور ہادیٔ برحق پر منتج ہوتی ہے۔ ہر حالت میں یادِ الٰہی میں سرشار، آدابِ بندگی سے آراستہ اپنی منزلِ مقصود سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اُن کی یہ روشن مثالیں اُن کی زندگی کے ہر دَور میں ہر مقام پر ملتی ہیں۔ گھر کی چار دیواری

میں بھی اور مسجد میں بھی۔ نجی اور معاشرتی محفلوں میں بھی اور جنگ کے معرکوں میں اور ایوانِ سلطنت میں بھی۔ خوبی یہ ہے کہ ہر آزمائش میں اُن کا جوہرِ انسانیت روشن سے روشن تر ہوتا چلا گیا۔ کبھی کوئی ایسا مقام نہیں آیا جہاں وہ انسانیت کے بلند ترین مقام سے ایک زینہ بھی نیچے اُترے ہوں۔ علامہ اقبال نے اسی معراجِ انسانیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ قطعہ ارشاد فرمایا تھا ؎

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردوں

حضورِ اکرم صلعم نے انسانی زندگی کے لیے ایک ضابطۂ حیات پیش کرکے جس معاشرتی نظام کی طرح ڈالی ہے، اس کا مرکزی اور کلیدی کارپرداز وہی مردِ مومن اور مردِ کامل ہے، جس کا اعلاترین نمونہ وہ خود تھے۔ خدا کی وحدانیّت پر راسخ یقین رکھنے والا اسلامی اخوّت، مساوات اور جذبۂ ہمدردی سے سرشار، قول و قرار کا پابند، عدل و انصاف کا حامل ہر وقت خدا کا خوف دل میں لیے ہوئے اُس کی رحمت اور رضا جوئی کا طلب گار، سعیٔ عمل میں کوشاں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ترجمان، کسبِ حلال پر ایمان رکھنے والا، اپنی ذمّے داریوں اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کا نگہبان، احترامِ آدمیّت کا علمبردار۔

معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ جو معاشرہ ایسے اوصاف کے حامل افراد پر مشتمل ہو، اس معاشرے میں کسی سماجی الجھن اور ناہمواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ وہ حرص و آز کی آویزشوں سے پاک، جھوٹی اور مصنوعی اقدار سے منزّہ، ایک ایسے متوازن اور منصفانہ معاشرتی نظام کا کفیل بن جاتا ہے۔ جو اپنی سلامت روی کے باعث، انسانیت کے بلند ترین نصب العین کے حصول میں ہر دور اور ہر زمانے کے تقاضوں کو بوجوہِ احسن پورا کرسکتا ہے۔ یہ معاشرتی نظام دنیاوی نعمتوں کے تمتع اور اس کے لیے تمام قدرتی وسائل کی بھرپور تسخیر سے ہرگز گریز نہیں کرتا بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے، لیکن اس سنگین پابندی کے ساتھ کہ دنیا

کا سروسامان، یہ مادّی وسائل "متاع الیٰ حین" ہیں۔ زندگی خود داد۔ اس کا تصرّف ایک امانت ہے، جسے چار و ناچار لوٹانا ہوگا اور اس میں خیانت کی کسی حرکت یا فعل کے لیے امانت دہندہ کے سامنے جواب دہ ہونا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جو شخص انسانیت کی ان بلند ترین اقدار سے گر کر محض نفس پرستی، طمع و لالچ کے گڑھے میں گر جاتا ہے، جو اپنی زندگی کو صرف مادّی آسائش کے حصول سے تعبیر کرتا ہے، وہ حضورؐ کے ضابطۂ حیات کے بنیادی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے۔ اس کے لیے اسلامی معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔ حرص و آز ایک ایسا ناسور ہے، جسے اگر کاٹا نہ جائے تو وہ معاشرے کے رگ و ریشے میں سرایت کر کے اُسے لامحالہ ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ معاشرتی کشمکش کے اس دور میں ہمیں ہر نوع کے نظریاتی سبز باغوں سے بہلا کر انھیں ہمارے ننگ و افلاس اور طبقاتی ناہمواری کا علاج بتایا جاتا ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ ان پر اسلام کی میٹھی لعاب کا غول بھی چڑھا دیا جاتا ہے۔ کیا یہ اسلام کے ایک مکمّل اور آخری دین ہونے کے دعوے کا مذاق نہیں ہے؟ کیا اُس کی قوّتِ عمل میں احساسِ کمتری کا اظہار نہیں ہے؟ لیکن سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے، کہ یہ سب کچھ کیوں؟ جواب افسوس کے ساتھ دینا پڑتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ابھی تک ہم نے اسلامی معاشرے اور اسلامی نظامِ معیشت کے محاسن کا ڈھول تو پیٹا ہے، جسے لوگ ازراہِ عقیدت سُنتے اور قبول بھی کرتے ہیں، لیکن کیا ہمیں ابھی تک اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عملی طور پر ان پر کاربند ہونے کی توفیق میسّر ہوئی ہے؟

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

تاریخ میں کوئی اور ایسی مثال نہیں پیش کی جاسکی کہ کسی انسان نے اپنے پیغام اور کردار کے برتنے پر دنیا میں ایک اتنا عظیم ذہنی اور تمدّنی انقلاب برپا کر دیا ہو جیسا کہ رسولِ عربی نے کیا ہے۔ اور طرّہ یہ کہ وہ ایک اُمّی تھے جنھیں عمر کے آخری حصّے میں اللہ کے نام کا پہلا سبق پڑھا گیا لیکن جس کی صدائے بازگشت دیکھتے دیکھتے اطرافِ عالم میں پھیل گئی۔

آج رسول مقبول صلعم کے نام لیوا انسان کروڑوں کی تعداد میں دنیا کے گوشے گوشے میں آباد ہیں، جو دن میں پانچ مرتبہ ان پر سلام اور درود بھیجنا اپنی اپنی متاعِ زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسی شمع ہیں جن پر کروڑوں مسلمان پروانوں کی طرح اپنی جانیں نچھاور اور قربان کر دینا جانتے ہیں۔ اُن کے ناموس پر بے دریغ کٹ مرنے کی مثالیں مسلمان قوم کی جانداری کا واضح ثبوت ہے۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن یہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ صرف احساساتی وابستگی کا اظہار ہے۔ اصل چیز اُس نمونۂ کامل کی مکمّل متابعت ہے جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے نجات اور بچاؤ کا ایک واحد ذریعہ ہے۔

قرآن کا وعدہ ہے:

أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ط

(اگر تم مومن ہو تو سب سے بالاتر ہو)

ویسا ہی مردِ مومن جس کی مثال حضورِ اکرم صلعم سے بہ طور نمونۂ کامل قائم کی ہے، یہ وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے جوابِ شکوہ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس وعدے کا اعادہ کیا ہے لیکن اس درست اور صحیح توضیح کے ساتھ ؎

کی محمدؐ سے وفا تونے، تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

شام ہمدرد۔ لاہور
جمعرات، ۷ مئی ۱۹۷۰ء

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
بہ حیثیت
رحمۃ للعالمین

جناب ڈاکٹر سراج الحق
صدر شعبۂ عربی و مطالعۂ اسلامی

دینِ اسلام خود بنی نوعِ انسان کے برابر قدیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علاقائی اور قومی اعتبار سے بڑی تعداد میں اپنے نبی اس دنیا میں بھیجے ہیں تاکہ وہ اسلام کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلائیں۔ نبیوں میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخری حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ان کی بدولت اسلام نے انتہائی عروج حاصل کیا۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں رحمۃ للعالمین یا جملہ بنی نوعِ انسان اور کائنات پر ترس کھانے والے کی حیثیت سے ان کا ذکرِ خیر کیا گیا ہے اور انھوں نے باشندگانِ عالم کو جو حسبِ ذیل پیغامات دیے، ان سے اس حقیقت کو سمجھنا آسان ہے :

توحید یا اللہ کی یکتائی کا پیغام

کلمۂ طیبہ یعنی لا الٰہ الا اللہ کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ کی سوا، جو رب العالمین ہے اور جو انسان کی قسمتوں کو بناتا، سنوارتا اور برقرار رکھتا ہے۔ کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ یہ کلمہ ہم میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ ہم کس طرح صرف ایک خدا کے

سامنے سر جھکائیں، کس طرح جملہ بنی نوعِ انسان کو برابر سمجھیں، اور آسمانی قوانین اور الہامی آئین کی ہدایات کے تحت امن و عافیت اور یگانگت کی زندگی بسر کریں۔ اسی کلمۂ توحید کی قوّت سے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے ان عربوں میں ایک زبردست اخلاقی انقلاب پیدا کیا جو بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کرتے جنگلیوں کی طرح زندگی گزارتے اور رات دن آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ یہی وہ کلمہ ہے جس نے دنیائے عرب میں اور ان ملکوں میں، جنھوں نے اسلامی عقائد کو قبول کر لیا تھا، ایک فضائے امن و آشتی پیدا کر دی۔

انسانی نسل میں اتّحاد کا پیغام

قرآن پاک کی سورہ ۲ آیت ۲۱۳ میں کہا گیا ہے:

"کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین"۔ بقر۔ ۲۱۳

"تمام بنی نوعِ انسان ایک امت کی صورت میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے (ان میں) پیغمبر بھیجے جو خوش خبریاں ساتھ لے گئے اور (ساتھ ہی) وہ خدا کا خوف دلانے والے بھی تھے۔"

سورہ ۴ آیت نمبر ایک میں قرآن پاک کہتا ہے:

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساءً

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک ہی فرد سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے سارے مرد عورت پیدا کیے۔"

سورہ ۴۹ آیت ۱۳ میں قرآن پاک کہتا ہے:

یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔

"اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمھیں قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ لیکن خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزّت والا وہی ہے جس کا کردار بہترین ہے۔"

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف التوع نسلوں سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام انسان اصلاً ایک ہیں اور اپنے وجود کے لیے ایک ہی خالق کے رہینِ منت ہیں اور یہ کہ وہ تمام رکاوٹیں، جو کہ جملہ بنی نوعِ انسان کو نسل وجنس اور رنگ وزبان کے اعتبار سے الگ الگ کرتی ہیں، دُور ہو جانی چاہئیں۔ نیز یہ کہ کسی بھی شخص کی عظمت وبرتری صرف اس کے اخلاق وکردار سے جانچی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہم سب ایک عالمگیر خاندان میں بھائی بہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وحی کی صورت میں پیغامِ اتحاد

جملہ بنی نوعِ انسان میں اخوت کے تصور کو مضبوط ومستحکم کرنے کے خیال سے اور لوگوں کو راہِ راست پر چلانے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں میں اور ہر زمانے میں پیغمبر اور رسول بھیجے۔ چناں چہ قرآنِ پاک کی سورہ ۳۵ آیت نمبر ۲۴ میں کہا گیا ہے:

انا ارسلنٰك بالحق بشيرًا ونذيرًا وان من امة الاخلا فيها نذير۔

"اور ہم نے حق بات کہنے والے، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ان کے درمیان بھیجے اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں ہم نے ڈرانے والا نہ بھیجا ہو۔"

اسی طرح سورہ ۴۰ آیت ۷۸ میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك و منهم من لم نقصص عليك۔

"اور ہم نے آپ سے قبل بھی رسول بھیجے ان میں سے بعض کے واقعات آپ کو بتا دیے گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔" گویا کہ پہلے آنے والے پیغمبروں کی تعلیمات کی تہ میں اصل صداقت ایک ہی جیسی ہے۔ لہٰذا تمام پیغمبروں کی پیروی کرنے والوں میں برادرانہ جذبات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور یہ بات قرآنِ پاک کی حسبِ ذیل آیت سے واضح طور پر سمجھی جا سکتی ہے:

ما يقال لك الاما قد قيل للرسل من قبلك ۔(۴۱:۴۳)

"کوئی اور بات تم سے نہیں کہی گئی اے محمدؐ سوائے اس کے جو تم سے پہلے آنے والوں سے کہی جا چکی ہے۔"

ایک بار پھر سورہ ۴۲ آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

شرع لکم من الدّین ما وصّٰی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔

شریعت کے جو احکام تمھیں بتائے گئے ہیں یہ وہی ہیں جو نوح کو دیے گئے تھے۔ یہی احکام تمھیں دیے جا رہے ہیں جس طرح (تم سے قبل) ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیے گئے تھے یعنی یہ کہ تم دین کو قایم کرو اور اختلاف نہ کرو۔

قرآن پاک کی سورہ ۲ آیت ۲۸۵ میں مزید کہا گیا ہے:

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل امن باللہ وملئکتہٖ وکتبہٖ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہٖ وقالوا سمعنا واطعنا

رسول نے اللہ کے تمام احکام قبول کیے اسی طرح مسلمانوں نے بھی۔ یہ سب کے سب خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے ان کا کہنا ہے کہ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کو اس سلسلے سے الگ نہیں کرتے اور ان کا قول ہے کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

رواداری کا پیغام

رسولِ مقبول صلعم نے رواداری کا جو اصول اختیار کیا، وہ اسلام میں ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ کو اہلِ عرب کی طرف سے شدید مخالفت اور جارحیت کا غیر معمولی رواداری اور صبر و تحمّل کے ساتھ سامنا کرنا پڑا۔ معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط وہ منشور، جو کوہِ سینا کے قریب خانقاہِ کیتھرین میں رہنے والے راہبوں کے لیے رسولِ اکرم صلعم نے منظور فرمایا اور فتحِ مکّہ کے دن قریش کے کافروں کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا، ان کا محض حوالہ اس حقیقت کا کافی ثبوت ہے کہ اسلام نے انتہائی رواداری سے کام لینے کی تلقین کی ہے۔

ہجرت کے چھٹے سال میں خانقاہ کے راہبوں اور تمام عیسائیوں کے لیے آں حضرت صلعم نے ایک منشور منظور کیا جو روشن خیالی کے ساتھ رواداری کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس کی رُو سے پیغمبرؐ اسلام نے عیسائیوں کے لیے اہم حقوق و مراعات کی ضمانت دی

اور مسلمانوں کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا کہ اس میں درج شدہ احکامات کی ہرگز خلاف ورزی نہ ہو یا ان کا غلط مفہوم نہ لیا جائے ورنہ سخت سزا کا مستوجب ٹھیرایا جائے گا۔ اس منشور کے ذریعے خود رسول اللہؐ نے ذمّہ داری لی اور اپنے صحابہؓ کو تاکید کی کہ عیسائیوں کی حفاظت کی جائے۔ ان کو ہر قسم کے مصائب و آلام سے بچایا جائے، ان کے گرجا گھروں کی اور ان کے پادریوں کی قیام گاہوں کی مدافعت کی جائے۔ ان پر نامناسب طور پر محصول عائد نہ کیا جائے، کسی پادری کو اس کے دائرۂ عمل سے بے دخل نہ کیا جائے، کسی عیسائی پر تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہ کیا جائے، کسی راہب کو خانقاہ سے نہ نکالا جائے، کسی زائر کو سفرِ زیارت سے روک کر حراست میں نہ رکھا جائے، مسلمانوں کے لیے مسجدیں یا مکانات تعمیر کرنے کے خیال سے عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو منہدم نہ کیا جائے۔ عیسائی عورتیں مسلمانوں سے شادی کرلیں تو ان کو ان ہی کے مذہب پر کاربند رہنے کا حق دیا جائے اور اس وجہ سے ان کو کسی قسم کے جبر و اکراہ کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ اگر عیسائیوں کو اپنی عبادت گاہوں یا خانقاہوں کی مرمت کے لیے یا اپنے مذہب سے متعلق کسی اور معاملے میں امداد کی ضرورت لاحق ہو تو مسلمان ان کی اعانت کریں۔

انصاف اور ثالثی کا پیغام

تقریباً چودہ سو سال گزرے، قرآن پاک نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ خدا کے واسطے گواہی اور ثالثی کے ذریعے انصاف سے کام لیں۔ اس میں اعلان کیا گیا:

یاایها الذین امنوکونوا قوّامین بالقسط شهداء لله ولوعلی انفسکم اوالوالدین والاقربین ان یکن غنیا اوفقیراً فالله اولی بهما فلاتتبعوا الهوی ان تعدلوا وان تلوٗا اوتعرضوا فان الله کان بماتعملون خبیراً (نساء۔۱۳۵)

اہلِ ایمان انصاف کو قایم رکھنے والے بن جاؤ اور خدا کے گواہ بن کر رہو اس گواہی کے بارے میں نہ اپنی ذات کا خیال کرو نہ ماں باپ اور رشتہ داروں کا خواہ ان میں سے کوئی غریب ہو یا مال دار، کیوں کہ ہر دو صورتوں میں خدا کا حق زیادہ ہے عدل و انصاف کے معاملے میں خواہشات کی پیروی نہ کرو اگر تم اعراض کرو اور کج روی اختیار کرو تو خدا علیم و خبیر ہے۔

قرآن پاک میں مزید ارشاد ہے:

وان طائفتٰن من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتّٰی تفیٓء الیٰ امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین۔ (حجرات: ۹)

اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں اختلاف ہو جائے اور وہ لڑنے لگیں تو ان میں صلح صفائی کرا دو اس کے بعد اگر ان میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو یہاں تک کے وہ خدا کا حکم ماننے پر راضی ہو جائے۔ اور انصاف سے کام لو خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اگر ثالثی کا مذکورہ بالا اصول اس زمانے کی اقوامِ متحدہ تک پہنچا دیا جائے تو ہر قسم کا وہ تنازعہ، جو قوموں کے مابین کھڑا ہو، آسانی سے چکایا جا سکتا ہے۔ اُس قوم کے خلاف نبرد آزمائی کر کے جو دوسری قوم کے حقوق و مراعات پر ڈاکہ ڈال رہی ہو اور اس طرح عالمی جمعیت میں امن و عافیت اور نظم و ضبط کی فضا طاری ہو سکتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ظلم ڈھانے والے فریق کے خلاف نبرد آزمائی کی جائے تو اس میں انتقامی جذبہ کارفرما نہ ہو اور نہ دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رعایت برتی جائے بلکہ انصاف اور مساوات کی روح عمل پیشِ نظر رہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو انصاف کی ترازو سے مساوات کا خیال رکھتے ہیں۔ لڑائی کا مطلب ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ ہتھیار ضرور استعمال کیے جائیں۔ ہر وہ دباؤ جو اخلاقی اور معاشرتی انصاف کے تقاضوں کے ذریعے ڈالا جائے جنگ و جدل کے مترادف ہے۔

جان کی حفاظت کا پیغام

ظہورِ اسلام سے پہلے کے زمانے میں عربوں کا دستور تھا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو غربت و افلاس یا اس خوف کی وجہ سے زندہ دفن کر دیتے تھے کہ لڑائی میں ہار جانے کے بعد کہیں دشمن کے ہاتھوں آبرو ریزی نہ ہو۔ مخربِ اخلاق رسم و رواج یا توہمات میں پھنس جانے کے باعث اہلِ عرب برادر کشی یا خواہر کشی کی جنگوں میں بھی مصروف رہتے اور کسی پشیمانی

کے بغیر ایک دوسرے کو قتل کر دیتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد قرآن پاک نے مندرجہ ذیل آیات کے ذریعے اس طرزِ عمل کو ممنوع قرار دیا:

ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقهم وایاکم ان قتلهم کان خطأً کبیراً (بنی اسرائیل: ۳۱)

اپنی اولاد کو تنگی اور فاقے کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمھیں اور اُن کو رزق دیتے ہیں بچوں کا قتل بڑا گناہ ہے۔

انه من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعاً (۵: ۳۲)

جو کسی کو بے گناہ قتل کر دے تو گویا اس نے سب ہی انسانوں کو مار ڈالا ایک آدمی کی جان بچانا ایسا ہی ہے جیسے سارے انسانوں کی جان بچانا۔

قرآن پاک نے قصاص یعنی بدلۂ خون کا قانون بھی نافذ کیا تاکہ مزید ہلاکت نہ ہونے پائے۔ اس میں کہا گیا ہے: ولکم فی القصاص حیٰوة یا اولی الالباب (۲: ۱۷۹) اور تمھارے لیے قانونِ قصاص میں زندگی ہے۔ اے اہلِ عقل!

حقیقت یہ ہے کہ اگر قصاص کا قانون رائج نہ ہوتا تو اس دنیا میں قتل و غارت کی کوئی حد نہ ہوتی۔

اسلامی جہاد کا پیغام

جہاد کا مطلب ہے، اللہ کی راہ میں کوشش کرتے رہنا اور اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ چناں چہ دشمنوں سے اپنے دفاع کی خاطر لڑنے کا مسئلہ بھی اس میں شامل ہے۔ لیکن جب ہم قرآن پاک کے الفاظ پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بار بار برائیوں کے خلاف جدّوجہد کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اکثر اسلام پر الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ تلوار کے ذریعے پھیلایا گیا ہے۔ یہ ناقابلِ قبول ہے۔ اگر ہم ان جنگوں اور لڑائیوں کا جائزہ لیں جو رسولِ مقبول صلعم نے اور ان کے ابتدائی خلفا نے سر کیں اور جن کے زمانے میں متعدد ملکوں نے اسلام قبول کر لیا تو حقیقت آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ دفاع کرتے رہے، جارحانہ اقدامات سے کبھی کام نہیں

لیا۔ عفو و درگزر اور رحم دلی کی بہترین مثال رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے دن پیش کی جسے دنیا کی تاریخ میں بے نظیر کہا جا سکتا ہے۔ وہ دس ہزار مسلمان، جنھوں نے اس روز مکہ شریف پر چڑھائی کی تھی، آسانی سے ان سب دشمنوں کو کچل سکتے تھے جنھوں نے ہجرت سے قبل آں حضرت صلعم کی جان لینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن آپؐ نے ان سب کو معاف فرما دیا۔

رسولِ مقبول صلعم بذاتِ خود جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے ایک پیکرِ رحم دلی و دردمندی تھے، قطع نظر اس سے کہ متعلقہ افراد کس مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ عہدِ نبوت کے پانچویں سال میں، بہت سے غریب نو مسلموں کو، جن میں جعفر بن ابی طالب شامل تھے، آں حضرتؐ نے اجازت دے دی کہ وہ ترکِ وطن کر کے قریب کے ایک نصرانی ملک حبشہ چلے جائیں جہاں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو سکتا تھا۔ اہلِ قریش نے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ انھوں نے قیمتی تحفے دے کر اپنا ایلچی حبشہ کے فرماں روا شاہ نجاشی کے پاس بھیجا اور کہا کہ تمام مہاجرین کو واپس مکہ بھیج دیا جائے۔ لیکن جب بادشاہ نے ان لوگوں کے نیک اطوار کا حال معلوم کیا اور سورہ مریم کا ایک رکوع سنا تو اہلِ قریش کے بھیجے ہوئے ایلچیوں کی طرف سے زبان گونگی اور کان بہرے کر کے خاموشی اختیار کر لی اور مسلمان مہاجرین کو اپنے ملک میں ہر قسم کی سہولتیں دینی شروع کر دیں۔ جب آں حضرت صلعم نے یہ خبر سنی تو وہ شاہ نجاشی سے بہت خوش ہوئے اور اس کے اور اس کے ملک کے حق میں دعائے خیر کی۔ ہمارے رسولِ اکرم صلعم ہی کی دعاؤں کی برکت ہے کہ حبشہ اب تک غیر ملکی حملوں اور پریشانیوں سے محفوظ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ۱۹۳۶ء میں اہلِ اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کیا اور گیس والے بموں کی مدد سے اس کو فتح کر لیا۔ شاہ ہیل سلاسی اپنا ملک چھوڑنے اور برطانیہ میں شاہی خاندان کے ساتھ پناہ لینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ اس وقت میں لندن میں اسکول اوصاف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کا طالب علم تھا۔ برطانیہ میں رہنے والے ہم مسلمانوں نے شاہ سلاسی کو ووکنگ مسجد میں جمعرات کے دن ۲۵ راگست ۱۹۳۶ء کو تشریف لانے کی دعوت دی اور ان کو سپاس نامہ پیش کیا۔ ہمارے سپاس نامے کے جواب میں اعلیٰ حضرت شہنشاہِ حبشہ نے مذکورہ بالا تاریخی واقعے کا حوالہ دیا اور مسلمان ملکوں سے ان الفاظ میں استدعا کی:

"دنیائے اسلام کے لیے پیغمبرِ اسلامؐ کے یہ الفاظ دوہرانے کافی ہیں کہ" حبشہ جو ایک مہمان نواز ملک ہے، ہمیشہ آزاد اور غیر ملکی غلبے سے پاک رہے۔ مصیبت اس پر نازل ہو جو

اسے پریشان کرے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کے مسلمان ہم خیال ہو کر آں حضرت صلعم کے الفاظ پر غور کریں، اس لیے کہ مناسب وقت یہی ہے کہ رسولِ مقبول صلعم کی سفارشات عمل میں آئیں۔

اعلا حضرت شہنشاہ ہیل سلاسی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہم بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ہم سب نے مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ شہنشاہ اور ان کا شاہی خاندان محفوظ رہے۔ اللہ کی شان دیکھیے، چند ہی ماہ میں اطالوی سپاہی ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کی وجہ سب کو اچھی طرح معلوم ہے۔

پس ہم دیکھتے ہی کہ وہ قوم، جو مسلمان مہاجرین کے لیے ان کے زمانۂ جہاد میں مہمان نواز تھی اور جس کی حفاظت کے لیے رسولِ اکرم صلعم نے اللہ تعالیٰ سے دعائے خیر کی تھی، اب تک ہمارے پیغمبرؐ کی بھیجی ہوئی برکتوں سے مالا مال ہے، حالاں کہ ان کی وفات کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔

صرف یہی نہیں۔ رسول اللہ صلعم جانوروں پر بھی مہربان تھے۔ انھوں نے صحابۂ کرامؓ کو تاکید کی تھی کہ باربرداری کے مویشیوں کو تکلیف نہ دی جائے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا جائے۔ جانوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے بارے میں کئی روایات موجود ہیں۔ لہٰذا ہم اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم بنی نوع انسان اور کائنات کے لیے سراپا رحمت تھے۔

شامِ ہمدرد، ڈھاکہ

جمعرات۔ ۱۴ رمئی ۱۹۷۰ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
تاریخ ساز

جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

یہ امر میرے لیے باعثِ سعادت ہے کہ میں ایک ایسے جلسے میں، جو ایسے مقدّس مقصد کے لیے منعقد کیا گیا ہے، شریک ہوں اور اس پہ مستزاد یہ کہ اس کی صدارت کا شرف مجھے حاصل ہُوا ہے اور پھر یہ کہ مجھے سردرِ کائناتؐ کی بارگاہ میں کچھ گُل ہائے عقیدت نذر کرنے کی سعادت بھی ملی ہے۔ میری اس مختصر تقریر کا موضوع، جیسا کہ حکیم محمدؐ سعید صاحب نے فرمایا، یہ ہے کہ حضور گرامی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ بابرکات کے متعلق یہ گزارش کردوں کہ آپؐ نے دنیا کی تاریخ کو کس طرح بنایا۔ ایک تاریخ ساز کے معنی میرے ذہن میں یہی ہیں کہ اس کی ایسی شخصیت ہو جس نے وقت کے دھارے کا مُنہ موڑ دیا ہو، جس نے انسانیت کو ایک ایسا لائحہ عمل عطا کیا ہو جس کے بعد نہ صرف اُن کے، جنھیں حلقہ بگوش رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہے، بلکہ تمام دنیا کے طور طریقوں میں نمایاں فرق آگیا ہو اور ایک ایسی انقلابی تبدیلی پیدا ہو گئی ہو جس سے انسانی زندگی، وہ زندگی ہی نہ رہی ہو جو لعثت سے پہلے تھی۔

میں آپ کی توجّہ اس طرف دلانی چاہتا ہوں کہ دنیا کے جتنے مورخ ہیں ان کی سمجھ میں ایک معمّہ نہیں آتا۔ بعض اسے معمّہ کہتے ہیں اور بعض عقیدت مند اسے ایک معجزہ کہتے ہیں۔

اور وہ معمّہ تاریخ کے اعتبار سے اور معجزہ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ آپؐ کی بعثت کے بعد آپؐ کی تعلیمات جس سرعت کے ساتھ دنیا میں پھیلیں اور چاروں طرف کے ممالک کے لوگوں نے جس شوق اور رغبت کے ساتھ انھیں قبول کیا اور اس کے علاوہ انھوں نے ایک بڑے خطّۂ زمین کی ساری زندگی کا انداز جس طرح بدل دیا وہ حیرت انگیز ہے۔ اور خطۂ زمین ایسا نہیں تھا جہاں پر تہذیب کی شمعیں پہلے روشن نہ رہی ہوں، جہاں پہلے ادیان نہ آچکے ہوں، بلکہ یہ علاقہ وہ تھا جو اس زمانے کی متمدّن دنیا کا، اور صرف متمدن دنیا ہی کا کیا بلکہ تمام دنیا کا، جو اس وقت کے متمدّن انسانوں کو معلوم تھی، وہ حصّہ تھا جو مرکز میں واقع تھا۔

عام طور پر مورّخ یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخی تبدیلیوں کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں اور وہ اسباب ایسے ہوتے ہیں جن کا تعیّن کیا جاسکتا ہے۔ معاشی حالات یا سیاسی تبدیلیوں کی بنا پر بڑی بڑی تحریکیں بعض اوقات پیدا ہوتی ہیں اور وہ زمانے میں پھیل جاتی ہیں، مگر اس حصّۂ عالم پر جب معاشی یا سیاسی عوامل کا کھوج لگاتے ہیں تو ہم کو یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ تحریک شروع ہوئی ان بادیہ نشینوں میں جن کی سیاست میں کوئی پیچیدگی نہ تھی اور جن کی معیشت میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ اور پھر یہ کہ وہاں سے چل کر یہ اُن علاقوں میں پہنچتی ہے جہاں کی سیاست کم از کم اس زمانے میں ایسی معلوم ہوتی تھی کہ اس وقت اس میں کسی انقلاب کی توقع نہ تھی۔ ایک آواز اٹھتی ہے اور اس آواز کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پرانے تخت الٹ جاتے ہیں، پرانی سلطنتوں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، ایک عرصے کی دبی ہوئی انسانیت پھر آزادی کا سانس لیتی ہے اور یہ سب اس طرح کہ ان کی سب مجبوریاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ خود ان صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے ذریعے سے یہ تعلیم آگے پھیلتی ہے۔

دنیا میں ایسی تحریکیں ہوئی ہیں جنھوں نے کچھ عرصے کے بعد کچھ حصّۂ زمین پر یا بڑے حصّۂ زمین پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے خیالات پر کچھ عرصے حکمران رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ادیان میں سے کہا جاسکتا ہے کہ مسیحیت نے دنیا کے بیشتر حصّے پر استیلا حاصل کر لیا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ خود مسیحیت دنیا کے ایک بڑے حصّے میں پھیل گئی لیکن مسیحیت کی تاریخ پر اگر روشنی ڈالی جائے تو وہ ایک ہادی کی آواز کا نتیجہ نہ تھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا اس اَمر کا اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض حضرات یہ کہیں گے کہ میں جو عرض کر رہا ہوں اس

میں مبالغہ ہے، مگر صورت یہ نہیں ہے ۔ صورت اصل میں یہ ہے کہ جن بنیادوں پر کلیسا قایم ہوا وہ بنیادیں تمام تر وہ نہیں تھیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم پر قایم ہوئیں بلکہ اس میں رومی اثرات تھے ۔ رومی اثرات اُس معاشرت اور اس نظام سلطنت کے تھے جس کا اس زمانے میں رواج تھا، اور کچھ اجزاء اس کے ایسے تھے جن کی تشکیل حضرت مسیحؑ کے بعد میں آنے والے لوگوں نے کی ۔ اگر یورپی مسیحیت کے استیلا کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اس استیلا کا باعث خود مسیحیت نہ تھی بلکہ معاشی اسباب کی بنا پر ایک انقلاب آیا تھا جس کا نام "صنعت کاری کا انقلاب"، رکھا جاتا ہے اور اس سے یورپ کو کچھ عرصے کے لیے ایسی قوّت حاصل ہو گئی تھی جس کے باعث اس کی طاقت اور دوسروں کی قوّت میں بے انتہا فرق پیدا ہو گیا اور اس طرح مغربی مسیحی اقوام دنیا کے بڑے حصّے پر غالب آ گئیں ۔ اِس وقت کیفیت یہ ہے کہ ان ممالک میں مسیحیت کا وہ اثر باقی نہیں ہے جو کلیسا کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اگرچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا تفوّق قایم ہے تاہم ہماری آنکھوں کے سامنے بعض نہایت اہم واقعات پیش آ رہے ہیں اور سب میں بڑا واقعہ یہ ہے کہ غیر مسیحی اقوام بھی وہ تمام گر سیکھتی جاتی ہیں جن کے ذریعے سے مغرب کا استیلا قایم ہوا تھا ۔ کچھ اس ترقی میں آگے ہیں اور کچھ اتنے آگے نہیں ہیں جتنی کہ بعض دوسری قومیں، لیکن یہ علوم پھیل پر ابر رہے ہیں ۔

اگر بدھ مت کے پھیلنے کا تجزیہ کیا جائے تو بھی یہ صاف نظر آئے گا کہ مہاتما بدھ کے زمانے میں اسے ترقی نہیں ہوئی اور اس کے بعد جو ترقی ہوئی بعض ذی اثر بادشاہوں، مثلاً اشوک کی کوششوں کی مرہونِ منّت تھی ۔ لیکن میرا موضوع اس سے ذرا ہٹا ہوا ہے اور میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخ کے بدلنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی بڑے علاقے کے لوگ کسی طرح سے دوسروں کے استیلا میں آ جائیں یا اس میں شریک ہو جائیں ۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ محض عقائد کو قبول کر لیا جائے ۔ تاریخ اصل میں بنتی ہے انسان کی پوری زندگی سے ۔ انسان کی زندگی کی کلیّت کو ذہن میں رکھنا چاہیے ۔ اس کی تبدیلی ہی تاریخ بنانے والی ہوتی ہے ۔ اگر آپ اسلام کے اثرات دیکھیں اور دوسروں سے مقابلہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ابتدا سے ہی اسلام نے نہ صرف دینی عقائد کو بلکہ پوری زندگی کی اصلاح کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ۔ یہاں پر میں دین کا لفظ اسلامی اصطلاح کے طور سے استعمال نہیں کر رہا بلکہ اس معنی میں استعمال کر رہا ہوں جس طرح دنیا میں اسے استعمال کیا جاتا ہے یعنی دین ایک چیز

ہے جس کا زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق نہیں ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح نے یہ فرمایا کہ جو چیزیں خدا کی ہیں وہ تم خدا کے حضور میں پیش کرو اور جو چیزیں قیصر کی ہیں وہ تم قیصر کو دو۔ اس طرح زندگی کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک کا انحصار معتقدات اور عبادات پر ہے اور دوسرے کا تعلق معاشرت، معیشت اور سیاست سے ہے۔ اسلام میں کبھی یہ دورنگی نہیں آئی۔ اسلام نے انسان کی زندگی کو لیا اور پوری زندگی کو لیا۔ اسلام نے اگر ایک طرف اس پر زور دیا کہ مسلمان خدا کے سامنے پانچ مرتبہ سربسجود ہوں، اگر اسلام نے ایسے لوگ پیدا کیے جن کی راتیں عبادت سے زندہ رہتی تھیں، تو اسلام نے ان ہی لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ اپنے عقائد کو بچانے کے لیے، دوسروں کے ظلم وستم کی مدافعت کے لیے، اپنے نقطۂ نظر اور اپنے نظریۂ حیات کی حفاظت کے لیے، ایک طرف یہ ضروری ہے کہ تم راتوں کو عبادت کرو دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ تم ہاتھ میں تلوار لے کر میدان میں آجاؤ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایک جز وقتی مشغلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے معنی ہیں کہ پوری زندگی اس کے لیے ہو۔ اگر جان کی بازی لگانی ہے تو جان کا دینا سعادت ہے اور اگر زندہ رہنے سے اسلام کی ترقی ہوتی ہے اور انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے تو زندہ رہنا فرض ہے۔ لیکن زندہ رہنے کے بعض طریقے ہیں۔ اسلام نے پہلے دن سے انسان کے ذہن کو، اس کی روح سے علاحدہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اسلام کی ساری تاریخ میں اس قسم کے واقعات نہیں ملتے کہ اگر کسی شخص نے کہیں پر نجوم کے سلسلے میں کوئی دریافت کی تو اسے مرتد قرار دیا گیا ہو اور اگر کسی نے طب کی طرف توجہ کی ہو تو اسے جادوگر بتایا گیا ہو اور پھر اسے اس امر کی سزا دی گئی ہو۔ اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ علم پر پہرے بٹھا دیے ہوں۔ بلکہ اسلام نے یہ کہا کہ تم علم حاصل کرو اس لیے کہ یہ دماغ بھی اسی اللہ کا دیا ہوا ہے جس نے تمھیں روح دی ہے اور جس نے تمھیں یہ جسم دیا ہے اور جس نے تمھارا معاشرہ بنایا ہے۔ اور اس معاشرے کو تم درست کر سکتے ہو اس طرح سے کہ تمھیں علم ہو اپنے اس ماحول کا جس میں تم رہتے ہو، اور تمھیں علم ہو ان تمام اشیا اور ان تمام قوتوں کا جن کے ذریعے سے تم اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہو۔ غرض یہ کہ آپ زندگی کا کوئی پہلو لے لیں، کوئی طریقہ اصلاح کا لے لیں، کوئی راستہ ترقی کا لے لیں، کوئی ایسا طریقہ لے لیں کہ جس سے انسانیت کا قدم آگے بڑھ سکتا تھا، اسے اسلام نے نظر انداز نہیں کیا

اگر ایک طرف اسلام کا عقیدہ مسیحیت اور بدھ مذہب کی طرح دنیا کے بڑے حصّے پر پھیلا تو یہیں پر اکتفا نہیں ہُوا کہ ایک بڑا حِصّہ دنیا کا عبادت کے ایک طریقے کو سیکھ لیتا یا یہ کہ وہ تارک الدنیا ہو کر رہبانیت کا نظام قایم کر لیتا یا یہ کہ وہ ایک ایسا کلیسا مرتب کر لیتا جو ان کی روحوں کا محافظ ہوتا بلکہ اس نئے عقیدے کا پھیلنا تو شرط سمجھا اس لیے کہ ایمان تو انسانی زندگی اور انسانی ترقی کی عمارت کی خشتِ اوّل ہے، لیکن اس نے یہ بھی کیا کہ ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا جس کی وجہ سے وہی بادیہ نشین جن کی جہالت دنیا میں مشہور تھی اس زمانے میں علم اور فضل کے علم بردار ہوئے اور آج دنیا اس بات کو مانتی ہے کہ اگر علم اور سائنس کسی کی وجہ سے زندہ رہے اور ان کی روایات برقرار رہیں اور انھوں نے ترقی کی، تو اس میں مسلمانوں کا بہت بڑا دخل ہے۔ یہ دعوانہ مسیحیت کے متعلّق کیا جا سکتا ہے اور نہ بدھ مذہب کے متعلّق۔

پھر یہ کہ مسلمانوں کو سیاست کے گُر سکھائے گئے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ عبادات کو قوانین و شرائع سے علاحدہ کیا جاتا۔ چوں کہ زندگی ان سانچوں میں ڈھلتی ہے جو شرع سے تعمیر ہوتے ہیں اس لیے شریعت کی طرف بھی زور دیا اور چوں کہ سیاست کے بغیر انسانی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے کہ دنیاوی نظام کی آخری شکل سلطنت ہے، ایک سیاسی نظام ہے، اس وجہ سے سیاسی نظام کے اصول بھی سکھائے گئے۔ غرض یہ کہ اسلام وہ پہلی تحریک تھی جو زندگی کو من حیث الکل لے کے آگے چلی تا کہ انسانی زندگی اعلا خوبیوں کی حامل ہو، اور اس میں ایک جامعیت پیدا ہو اور ایسا نہ ہو کہ اس کا ایک پہلو تو آگے بڑھ جائے اور دوسرے پہلو تشنہ رہ جائیں۔ وہ توازن جو انسانی زندگی کا خاصّہ ہونا چاہیے وہ اسلام نے پیدا کیا۔ اس سلسلے میں آپ بعض اور تحریکات کا بھی جائزہ لیں۔ محض دینی تحریکات کا ذکر نہیں ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے دنیا میں انقلاب برپا کیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے انسانی زندگی پر اثر ڈالا لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا کُلّی اثر کیا پڑا۔

جب صنعت کاری کا انقلاب یورپ میں آیا اور جس دن سے اس کی ابتدا ہوئی تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسی دن سے اخلاقی اقدار کے مسمار ہونے کی بھی ابتدا ہوئی۔ سبب یہ ہے کہ انسان کے ذہن کو اخلاقی اور دوسری ضروریات زندگی سے ہٹا کر محض اکتساب دولت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ جب اکتسابِ دولت ہی مقصد زندگی قرار پایا تو پھر اس زندگی میں اخلاقی اور روحانی قدروں کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اور اسی طرح اگر کارل مارکس کے انقلاب پر نظر ڈالیں تو اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کارل مارکس کی تعلیمات کو جس طرح لینن نے عملی جامہ

پہنچایا اس سے دنیا کے ایک بڑے حصے کے انسانوں کی زندگی پر اثر پڑا لیکن میں پھر گذارش کروں گا کہ اس میں انسانی زندگی کی بعض بنیادی ضروریات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں وہ تشنگی بھی ہے جو اس کی روح میں پائی جاتی ہے۔ یہ تشنگی اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح میں ودیعت کی ہے۔ ٹھیک ہے کہ کارل مارکس نے گرجا اور مسجد سے لوگوں کو نکال لیا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ پھر مارکسزم کے عقیدت مند بالکل عبادت کا سا عقیدہ لے کر لینن کی قبر پر اور لینن کی تصویروں کے سامنے حاضر ہونے لگے۔

تاریخ کو بدلنے کے اعتبار سے بہت سی قوتیں عمل میں آئیں اور بہت سی تحریکیں دنیا میں ابھریں۔ لیکن جس تاریخ کی بنیاد حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اس کی جامعیت کسی میں پیدا نہ ہوئی اور یوں کہ جامعیت کسی تحریک میں نہ تھی اس لیے دنیا کے کسی تاریخ ساز کو وہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جو حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا تھا۔ سکندر نے بڑی بڑی فتوحات کیں، نپولین نے بڑی جنگیں جیتیں لیکن اب ان کے آثار کہاں باقی ہیں؟ بنی نوعِ انسان نے بہت سے انقلاب دیکھے ہیں۔ کوئی پچاس سال میں کمزور پڑنے لگا تو اور کوئی اتنا بھی نہیں چلا اور صرف اس وجہ سے کہ اس نے زندگی کے بعض بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ اگر اسلام پر عمل کیا جائے تو اسلام میں کمزوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ صحیح اسلام وہ ہے جو زندگی کا توازن قایم رکھے، جو زندگی کی مختلف ضروریات کو ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ رکھے کہ ایسا نہ ہو کہ افراط و تفریط پیدا ہو جائے۔ مسلمانوں میں اگر کبھی کمزوری آئی ہے تو وہ اسلام پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آئی ہے، افراط و تفریط کی وجہ سے آئی ہے۔ کہیں پر بے عملی پیدا ہو گئی تو کہیں پر بدعقیدگی۔ اگر روح اور دماغ کو اور جسمانی ضروریات کو، اس علم کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوا ہے اور اس ذہن کے ساتھ جو اسلام تعمیر کرتا ہے لے کر چلا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ایسی تحریک جو ابدالآباد تک قائم رہنے والی ہے، اور جس کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا وہ اسلام ہی ہے۔ دنیا کی تاریخ بنانے میں اسلام کو جو دخل رہا ہے، اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ رہے گا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسی تاریخ کی، جو ہمیشہ زندہ رہے گی اور برابر بنتی رہے گی اور کبھی بگڑے گی نہیں، بنیاد رکھنے والی ہستی حضرت سرورِ کائناتؐ کی ذات گرامی ہی ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

شامِ ہمدرد، کراچی
۱۵ رمئی ۱۹۷۰ ش

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم
بہ حیثیت
رَحمۃٌ لِلعالمین

ملّا واحدی صاحب

جہاں تک ملکِ عرب کا تعلّق ہے تمام باخبر اور منصف مزاج غیر مُسلم بھی حضورِ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رَحمۃٌ لِلعَرَب تسلیم کرتے ہیں۔ تیئس سال کی قلیل مدّت میں حضورؐ نے عرب میں جو مقدّس اور مبارک انقلاب پیدا کیا تھا اُسے جاننے کے بعد ایک شریف انسان اِس انقلاب کے لانے والے کو رحمت کے سوا کیا کہہ سکتا ہے۔

کروڑوں دیوانوں کو فرزانہ اور جاہلوں کو عالم بنانا، کروڑوں ناشائستوں کو شائستگی اور بداخلاقوں کو اخلاق سِکھانا، رحمت نہیں تو کیا ہے۔ لیکن رَحمۃٌ لِلعالمین حضور صلعم کو صرف مُسلمان مانتے ہیں۔

جنھوں نے انقلابِ عرب کی تاریخ پڑھی ہے، اور جو حضور (صلعم) کو عرب کے حق میں رحمت سمجھتے ہیں وہ کاش اتنا اور سوچتے کہ اپنے گھر کو گندگیوں اور برائیوں سے پاک کر دینا بھی تو پڑوسی کے لیے رحمت ہوا کرتا ہے۔ پھر جس ذاتِ اقدس نے اپنے ملک کو گندگیوں اور برائیوں سے پاک کیا وہ اپنے چاروں طرف کے ملکوں کے لیے رحمت کیوں نہیں تھا۔ جس چیز کو حضور (صلعم) نے اپنے ملک کے واسطے پیش فرمایا اور جسے اُس ملک کے سبیلے رحمت قرار دیا جاتا ہے، اُسی کو تو چاروں طرف پہنچایا گیا تھا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قومیت کو اپنے ملک میں محدود نہیں رکھا۔ یہ نہیں کہا کہ عرب سب سے غیریت برتیں، سب کو ذلیل سمجھیں، سب کے دشمن بن جائیں۔ حضور (صلعم) نے قومیت کی بنیاد وطن، رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کے بجائے عقیدے اور آئیڈیولوجی پر قائم

فرمائی۔ کبھی آدم کے بیٹے صدق دل سے آدم کی رُوح کو خوش کرنے کا ارادہ کریں گے، کبھی روز روز کی جنگوں سے تنگ آکر دُنیا ایک دوسرے سے صلح پر آمادہ ہوگی، کبھی ملکوں کی حد بندیاں گھروں، محلّوں اور شہروں کی سی حد بندیاں رہ جائیں گی۔ جس طرح ایک گھر کا رہنے والا اپنے گھر والوں سے خصوصیت برت کر برابر کے گھر والوں کا بھی بھائی ہوسکتا ہے، جس طرح ایک محلّے کے لوگوں کو اہمیت دے کر دوسرے محلّے والوں کے بھی دوست بن سکتے ہیں، اور جس طرح ایک دہلوی دہلویت کا عاشق ہونے کے باوجود لکھنوی اور لاہوری کو اپنا عزیز کہہ سکتا ہے۔ اُسی طرح مُلکوں کے آپس کے سلوک کا دَور آئے گا، جو الحمد للہ اب آتا دکھائی دیتا ہے، تو پھر اِس اسلامی تحریک کی قدر ہوگی کہ بنی آدم ایک قوم ہیں، وہ کسی گھر، کِسی محلّے، کسی شہر اور کسی مُلک میں رہتے ہوں۔ اِسلام فلاحِ انسانی کا چشمۂ رواں ہے۔ اِسلام نے پہلے عرب کو سیراب کیا اور پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔

عرب کے کل قبیلے ایک دوسرے کے بَیری تھے۔ حضور (صلعم) نے اُنھیں شیر و شکر کر دیا۔ قبیلوں کا اتحاد ہی تو تھا، جس نے قبیلوں کے مجموعے میں وہ اوصاف رُونما کیے جس کی بنا پر حضور کو رَحْمَۃٌ لِّلْعَرَب مانا جاتا ہے۔ پھر یہی اتحاد اگر ملکوں ملکوں میں ہوجائے تو عالم انسانیت کے لیے کتنا مفید ہے۔ لہٰذا ملکوں ملکوں میں اتحاد کرانے والے کے رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِین ہونے میں کیسے کلام کیا جا سکتا ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، اکیلا میں ہی اللہ کا رسول اور پیغمبر نہیں ہوں، فلاں فلاں جن کے نام تم نے سُنے ہیں اور جن کے نام دُور ہونے یا پُرانے ہوجانے کے سبب تم تک نہیں پہنچے، سب رسول اور پیغمبر تھے۔ دنیا کا کوئی قریہ اور گوشہ نبی سے محروم نہیں چھوڑا گیا۔ مسلمانوں کو اجازت نہیں ہے کہ دوسروں کے کسی بزرگ کو بُرا کہیں مبادا وہ بزرگ نبی ہو۔ یہ تعلیم رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِین کے علاوہ بھی کسی کی ہوسکتی ہے؟ کیا یہ حضور (صلعم) کی رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِینی کا بیّن ثبوت نہیں ہے کہ حضور (صلعم) نے اپنے اُمتیوں کے دل میں دوسروں کے پیشواؤں کی اُلفت کے جذبات بھر دیے ہیں۔ کسی ملک سے، کسی قوم سے، کسی قوم کے پیشواؤں سے، کسی قوم کے خود ساختہ معبودوں تک سے کیسا برتاؤ کرنا چاہیے اِسے حضورؐ کی تعلیمات میں تلاش کیجیے اور پھر دیکھیے کہ حضور رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِین ہیں یا نہیں۔

بعض غیر مسلموں کا خیال ہے کہ اسلام جس قومیت کا مُدعی ہے وہ حُبّ وطن کے

منافی ہے۔ خدا جانے دوسروں سے محبت کے معنی یہ کہاں سے لیے گئے ہیں کہ اپنوں سے محبت نہ کی جائے۔ اسلام دین الفطرت ہے، فطرت کے خلاف حکم نہیں دے سکتا۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ اپنے ملک سے کیا، پہلے تو خاص اپنے گھر سے محبت کی جائے۔ گھر کے بعد اپنے ملک کا نمبر آتا ہے اور باقی دنیا اپنے ملک کے بعد ہے۔ اسلام نے تو حُبِّ وطن کو جزوِ ایمان بنایا ہے۔ ہاں رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِین یہ نہیں چاہتے کہ وطن کی محبت اور وطن کی صنعت، تجارت اور دولت بڑھانے کے جوش میں عام انسانیت کو بھلا دیا جائے۔

اِس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رحمۃٌ لِّلْعَالَمِینؐ کی بعثت کے وقت انسان کی بڑی ہی ذلیل حالت تھی۔ انسان کا مجد و شرف ممکن ہے کبھی پہلے قائم رہا ہو۔ لیکن اُس وقت انسان دنیا بھر میں یا خدا تھا یا غلام، انسان کہیں نہیں تھا۔ رحمۃ لِّلْعَالَمِینؐ نے اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کا اعلان کر کے انسان کی خدائی کا خاتمہ کر دیا اور غلام حبشی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر شخص سے آقا کہلوا کر غلامی کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالیں۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضور (صلعم) نے بردہ فروشی کو جس طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا، اُس میں شان رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بات بات پر غلام آزاد کرنا، موقع موقع پر غلاموں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید، غلاموں کو اُمرا و رؤسا اور خود اپنے کنبے کی بیٹیاں دلوانا، غلاموں کو لشکروں کا سردار بنانا، غلاموں کو نماز میں برابر کھڑا کرنا، ان باتوں میں کیا چیز پوشیدہ تھی۔ آیا بردہ فروشی کی حمایت یا بردہ فروشی کا عاقلانہ و مدبّرانہ استیصال؟

جو ذات پات کے تفاخر کو منع کرتا ہو، جس نے کہہ دیا ہو کہ صرف ایمان اور عمل وہ چیزیں ہیں، جن سے انسان عزّت کا مستحق ہوتا ہے وہ غلامی کو کس طرح جائز سمجھے گا؟

رحمۃ للعالمینؐ کو صرف غلامی ہی سے بیزاری نہیں تھی، حضور (صلعم) نے ایک دوسری غلامی کا بھی قلع قمع کر دیا جو ہر آزاد عورت کو مرد کی کرنی پڑتی تھی۔ صرف شوہر کی غلامی نہیں، باپ کی غلامی، بیٹے کی غلامی، خاندان کے تمام مردوں کی غلامی، ہر آزاد عورت کو عمر کے مختلف حصّوں میں بھگتنی ہوتی تھی۔ رحمۃ للعالمینؐ نے اِس غلامی سے عورت کو نجات دلائی۔ اُسی عورت کو جس کی بابت قریب قریب اُسی زمانے میں حکما اور عقلا کی ایک کانفرنس غور کرتے کرتے ازراہِ عنایت اس نتیجے پر پہنچے کہ عورت میں بھی مرد کی

سی روح ہے، جو عورت بھیڑوں اور بکریوں کی مثل ورثے میں تقسیم ہوا کرتی تھی اُسے رحمۃ للعالمینؐ نے مرد کے تخت پر لا بٹھایا اور ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ فرماکر برابری کی انتہا کر دی۔

ایک اور غلامی کا انسداد کیا۔ اِس غلامی سے مرد بھی بچے ہوئے نہیں تھے۔ یہ خیال اور رائے کی غلامی تھی۔ کوئی انسان اپنے دماغ کا مالک نہیں تھا۔ عربوں کے سردار، یہودیوں کے احبار، عیسائیوں کے پادری اور ہندوؤں کے پنڈت سفید اور سیاہ پر قابض تھے اور انسانوں کو کٹ پتلیوں کی مانند نچاتے تھے۔ افراد یا اشخاص کا خاندان یا قبیلے سے الگ وجود نہ تھا۔ رحمۃ للعالمینؐ پہلی ہستی ہیں، جنھوں نے فرد کی اہلیت تسلیم کی۔ اُس کی فردیت اور شخصیت کو اتنا اُبھارا، چمکایا اور بڑھایا کہ اسی پر مدنیت کی بنیادیں رکھ دیں اور قصرِ شائستگی کی ہر اینٹ کو اُس کی جگہ مضبوط و مستحکم کر دیا۔ ہر فرد اور ہر شخص کو الگ الگ اس قابل بنا دیا کہ دوسرے افراد و اشخاص کے ساتھ مل کر کام کرے تاکہ صحیح اور سچا جلالِ جمہوریت نمودار ہو۔ رحمۃ للعالمینؐ نے ہوا اور پانی کی طرح انسان کے لیے آزادی عام کر دی۔ رحمۃ للعالمینؐ نے بادشاہوں کی خدائی اور راہبوں کے فریب دونوں کا پردہ چاک کر دیا اور موہوم قوتوں کے آگے جھکنے والوں کو پیغام دیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی اطاعت مت کرو۔ اللہ اور بندے کے درمیان نہ راجہ حائل ہے نہ پروہت، نہ چاند سورج حائل ہیں نہ پہاڑ اور سمندر۔

رحمۃ اللعالمین نے سمجھایا کہ قیادت وسعادت کے لیے نسلی تفوّق ہرگز ضروری نہیں ہے۔ جملہ انسان بہ اعتبار پیدائش یکساں ہیں۔ جُملہ انسان ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہیں۔ معزّز و مکرّم فقط وہ ہے، جس میں ذاتی جوہر ہوں، اور سب سے بڑا جوہر تقویٰ ہے۔

رحمۃ للعالمینؐ ہی کے ذریعے یہ حکم ہمیں ملا ہے کہ معاملات باہمی مشورے سے طے کرنے چاہئیں۔ واحد شخص کا حکم نہیں چلنا چاہیے۔ رحمۃ للعالمینؐ نے پہلی مرتبہ دنیا کو جتایا کہ افراد کی ضروریات اور افراد کی صلاحیتوں کی نشو ونما معاشرے کے ذمّے ہے۔ ترقی یافتہ اور مُرفّہ الحال ساری قوم کو ہونا چاہیے، چند افراد کو نہیں۔ چند افراد کا ذرائع پیدا وار پر قبضہ جما لینا، دوسروں کی محنت کے ماحصل سے دولت مند بن جانا، اور دولت

پر سانپ بن کر بیٹھنا، تینوں حرکتیں عظیم ترین جرائم ہیں۔ ایسی دولت آتشِ جہنم میں تپائی جائے گی اور دولت جمع کرنے والوں کی پیشانیاں اور پیٹھیں اور پہلو اُس سے داغے جائیں گے۔

اسلام ماضی کا ہی مذہب نہیں مستقبل کا بھی مذہب ہے۔ جس ڈگر پر حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دنیا کو چودہ سو سال قبل ڈالا تھا۔ اُس ڈگر پر دنیا آج خود بخود آتی جاتی ہے۔ جو باتیں چودہ سو برس قبل نئی اور عجیب تھیں اُنھیں آج سمجھنا آسان ہے اور جوں جوں زمانہ گزرے گا، اُنھیں اور زیادہ سمجھا جانے لگا۔ کاش ہم مسلمان نمونے کے مسلمان بن جائیں۔ ہماری بے راہ روی نے اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

درود پڑھیے اور سلام بھیجیے اُنؐ پر جو تئیس سال میں اتنا کام کر گئے کہ اتنا کام صدیوں میں ہونا ممکن نہیں تھا اور ایسا کام کر گئے کہ ساری دنیا کا زاویۂ نگاہ بدل ڈالا۔

آج کے مسلمان کو مت دیکھیے، آج کی پوری دنیا کو قرآن کی کسوٹی پر کسیے اور قرآن سے قبل کئی دنیا کا جائزہ لیجیے۔ دنیا اُسی بہاؤ میں بہتی نظر آئے گی، جسے حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بہایا تھا۔ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم دنیا کے لیے علم و عمل کے نئے سرچشمے کھول گئے ہیں اور دنیا کو غور و خوض کی بالکل نئی شاہراہیں دکھا گئے ہیں۔ انسان اور انسانیت کی ترقی کی وہ کون سی چیز ہے جس کی ابتدا حضورؐ نے نہیں کی۔ غلامی کا سدباب سب سے پہلے حضور (صلّی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام سب سے پہلے حضورؐ کے ہاتھوں مٹا۔ نسلی اور جغرافیائی امتیازات کا سب سے پہلے حضورؐ نے خاتمہ کیا۔ اکتسابِ علم کی طرف سب سے پہلے حضور (صلعم) نے متوجہ فرمایا۔ دنیا کو ایک مرکز پر آنے کی سب سے پہلے حضور (صلعم) نے دعوت دی۔ وغیرہ وغیرہ۔

جذبات کو تھوڑی دیر کی چھٹی دے دیجیے اور طالب علم کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کا اور حضورؐ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے۔ حضورؐ (صلعم) ہمیں وہ مسلک عطا کر گئے ہیں جس کا خلاصہ باہمی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت ہے اور جس نے دنیا اور آخرت میں سنگم پیدا کر دیا ہے۔ حضور (صلعم) نے وراثتی بادشاہت اور پاپائی قسم کی مذہبی پیشوائی کی جڑیں اس وقت کھود دیں جب اِن باتوں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ حضور (صلعم) تھے اور حضور (صلعم) کی تربیت کی ہوئی جماعت نے اپنی بجائے

اللہ کی حکومت قائم کی تھی۔ بقول ایک یورپین مصنّف کے" لفظ اسلام میں تمام فرائض انسانیت سمیٹ دیئے گئے تھے"

(میں نے اِس مضمون کے لکھنے میں بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے۔ خاص طور پر کیمبلپور کے ایک بزرگ وکیل مولوی الف دین صاحب مرحوم کی تحریروں نے مجھے بڑی مدد دی۔ اللہ اُن پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ مولوی الف دین میرے ماہ نامے" نظام المشائخ" کے بہت پُرانے اور ممتاز مضمون نگار تھے۔ واحدی)

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت مُعلّم

مولانا حکیم سیّد احمد اللہ ندوی

اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت منصب رسالت کے ساتھ تعلیم دینے والے معلّم کی حیثیت کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (الجمعۃ ۶)

اسی اللہ نے بھیجا اَن پڑھ لوگوں کو ایک رسول انھیں میں سے، پڑھ کر سُناتا ہے اُن کو اس اللہ کی آیتیں اور اُن کو سنوارتا ہے اور تعلیم دیتا ہے انھیں کتاب اور عقلمندی کی اور اس سے وہ پڑے ہوئے تھے صریح گمراہی میں۔

آج سے چودہ سو برس پہلے ملک عرب میں تعلیم کا رواج نہیں تھا، کسی کسی گھرانے میں بعض آدمی معمولی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اسی لیے ملک کے لوگوں کو اُمّی یعنی اَن پڑھ کہتے تھے۔ اُم کے معنیٰ ماں کے ہیں، ماں کے پیٹ سے بچّہ بے پڑھا لکھا پیدا ہوتا ہے۔ اسی بے پڑھے لکھے نوزائیدہ بچّے کی طرح عرب کے باشندے اَن پڑھ تھے، جس کی وجہ سے اُن کو اُمّی کہا گیا، اُس زمانے میں عرب کے لوگوں کو اپنے اُمّی ہونے پر فخر تھا۔

ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی نبی اُمّی قرآن مجید میں ہے، کیونکہ آپ نے بھی لکھنا پڑھنا کسی دنیاوی اُستاد سے نہیں سیکھا تھا، جس کی بابت قرآن مجید کی یہ آیت نشاندہی کرتی ہے:

مَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ

پہلے آپ نے نہ کوئی کتاب پڑھی تھی اور نہ اپنے دست راست سے کچھ لکھا تھا۔

اُس زمانے کے عرب کے لوگوں کی دوسری زبوں حالت صریح گمراہی میں مبتلا ہونے

کی سورہ جمعہ والی آیت میں بتائی گئی ہے۔ یہ گمراہی عام تھی، عقائد کی، اخلاق و عادات کی، رسم و رواج کی، افکار و خیالات کی اور توہمات اور بداعمالی کی۔

اللہ تعالےٰ نے جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنانا چاہا تو اس سے پہلے آپ کو پڑھایا، آپ کے معلّم اوّل حضرت جبریلِ امین علیہ السّلام تھے جو تمام فرشتوں کے سردار تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس غارِ حرا میں آئے اور کہا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الخ — پڑھیے اے محمد اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا ہے۔

سورۂ نجم میں حضرت جبریلِ امین نے آپ کو تعلیم دی ہے اُس کے متعلق یہ آیت ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ — حضرت جبریلِ امین نے جو سخت قوتوں والے زورآور ہیں آپ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دی ہے۔

بمقام غارِ حرا پہلی ملاقات میں حضرت جبریلِ امین نے آپ کو تین بار سینے سے لگا کر زور سے دبایا جس سے آپ میں معارفِ ربّانی کے قبول کرنے کی کامل استعداد پیدا ہو گئی، جب آپ تعلیمِ الٰہی سے جو ذریعہ حضرت جبریل علیہ السّلام دی گئی مالوف ہو گئے تو براہِ راست ذاتِ احدیت اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف سے ذریعہ القار، الہام اور وحی آپ کی تعلیم ہوتی رہی؛ قرآن شریف میں ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيماً — اللہ نے آپ کو اُن علوم و معارف کی تعلیم دی جن کو آپ نہیں جانتے تھے، اللہ کا فضل آپ پر بڑا ہے۔

دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ٥ (اعلیٰ) — ہم آپ کو پڑھائیں گے جسے آپ نہیں بھولیں گے۔

الٰہی تعلیم جو اللہ تبارک و تعالیٰ سے براہِ راست حاصل ہوا سے علم لدُنّی کہتے ہیں۔

آپ کو جس قدر تعلیم حضرت جبریلِ امین کے توسط سے یا براہِ راست ذاتِ الوہیت تقدس و تعالیٰ سے حاصل ہوئی وہ بغیر قلم کے واسطے کے ہوئی، اس تعلیم میں علوم الٰہی، معارفِ ربّانی، حقائقِ تکوینی، علوم اوّلین و آخرین سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا،

جس کے بعد آپ کو پُوری نوع انسانی کی تعلیم کے لیے مامور کیا گیا، آپ نے بھی بغیر قلم و دوات کے لوگوں کو تعلیم دی۔ آپ کے اولین مخاطب ملک عرب کے لوگ قرار دیئے گئے، کیونکہ آپ عرب قوم میں پیدا ہوئے تھے، اور ثانوی مخاطب دنیا کے سارے لوگ قرار پائے۔

تعلیم کے لحاظ سے تاریخِ عالم کا موجودہ دور سب سے زیادہ تعلیمی زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں تعلیم کے لیے مدّتِ تعلیم، نصاب تعلیم، زبانِ تعلیم، اساتذہ تعلیم اوقاتِ تعلیم اور نظامِ تعلیم وغیرہ امور کے لیے اصول و قواعد مرتب کیے گئے ہیں جس کے لیے ہر ملک اور قوم اور حکومت کی طرف سے سالانہ لاکھوں اور کروڑوں رُوپے صرف کیے جاتے ہیں، لاکھوں کتابیں ہر سال طبع کی جاتی ہیں، ابتدائی تعلیم سے لے کر انتہائی تعلیم پی ایچ ڈی تک پہنچنے کے لیے تقریباً بیس۲۰ سال لگ جاتے ہیں۔ اس تمام جدوجہد کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ بہت تھوڑی تعداد میں ماہرینِ تعلیم تیار ہوتے ہیں اور تعلیمی رُوح جو اخلاقِ فاضلانہ اور اوصاف حمیدہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اس سے متصف ہونے والوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے جو اپنی قوم اور بنی آدم کی مخلصانہ رہنمائی کر سکے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اوّل مخاطب قوم عرب کی تعلیم کا آغاز کیا تو آپ کے پاس نصابِ تعلیم کی صرف ایک کتاب تھی جس کا نام قرآنِ مجید ہے، جو اللہ کی کتاب ہے، یہی ایک کتاب آغازِ تعلیم سے لے کر انجامِ تعلیم تک نصاب تعلیم میں رکھی گئی، یہی ایک کتاب اللہ، مردوں کے لیے بھی تھی اور عورتوں کے لیے بھی، بڈھوں کے لیے بھی تھی اور بچّوں کے لیے بھی، شہریوں کے لیے بھی اور دیہاتیوں کے لیے بھی، امیروں کے لیے بھی تھی اور غریبوں کے لیے بھی بلکہ پوری دُنیا کی تمام نوع انسانی کے لیے بھی، زبانِ تعلیم عربی، تعلیم دینے والا رسولِ عربی، صرف ایک معلّم درس گاہِ عالم میں تعلیم دینے کے لیے مامور من اللہ ہوا، اس درسگاہِ محمّدی میں اہلِ عرب کے علاوہ تعلیم پانے والوں میں فارس کے سلمان فارسی بھی تھے اور ملک حبش کے بلال حبشی بھی اور روم کے صہیب رومی بھی (صہیب اگرچہ عربی النسل تھے مگر بچپن سے پرورش روم میں پائی تھی) تعلیم سوائے اوقات نماز اور خواب اور اوقات حوائج ضروریہ کے مسلسل شب و روز جاری رہتی تھی۔ کبھی آپ کھڑے ہو کر تعلیم کے خطبہ کے ذریعے دیتے، کبھی مجمع عام میں اونٹ پر سوار ہو کر (مثلاً حجۃ الوداع میں) اور اکثر

نشست فرما کر تعلیم فرماتے، اور کبھی چلتے پھرتے بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آپ بہت ہی شستہ، سلیس اور مختصر الفاظ میں تعلیم دیتے۔ آپ افصح العرب اور شیریں کلام تھے، کبھی آپ پیچیدہ اور ژولیدہ اور ناشائستہ الفاظ استعمال نہیں فرماتے تھے۔ آپ کے مخاطب آپ کے الفاظ کے مفہوم کو بہت جلد سمجھ جاتے تھے۔ اکثر آپ دینی مسائل خود عمل کر کے دکھاتے اور سمجھاتے، وقت ضرورت سمجھانے کے لیے کسی جملہ کو دو دفعہ دہرا دیتے تھے۔ تعلیم دینے میں غصہ نہیں کرتے تھے۔ آپ کے سامنے اصحاب (تلامذہ) مؤدب ہو کر وقار کے ساتھ خاموش رہ کر آپ کے ارشادات کی سماعت فرماتے تھے اور اپنے دلوں کی گہرائیوں میں جگہ دیتے تھے اور ان ارشادات و تعلیمات نبوی کو جو اُن کے سینوں میں محفوظ ہو چکے تھے دوسروں کے سامنے تلقین کرتے، اس تلقین کا نام روایت ہے اس طرح سینہ بہ سینہ روایت منتقل ہونے لگی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زبانی تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم بھی دیتے جاتے تھے، وضو کرنے اور نماز میں قیام وقعود، رکوع و سجدہ، مناسک حج اور دیگر ارکان اسلام کو آپ نے عمل کر کے دکھایا۔

قرآن شریف کی آیتیں یا سورتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر نازل ہوتیں اس وقت آپ اپنے اصحاب کو زبانی یاد کرا دیتے تھے اور مخصوص کاتبوں سے بشکل تحریر لکھوا دیتے تھے اس طرح قرآن مجید آپ کے اصحاب کے سینوں میں محفوظ ہو جاتا اور تحریری شکل میں بھی ساتھ ساتھ قلمبند ہو جاتا تھا۔

آپ کی خاص توجہ اس طرف ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمان پورے قرآن شریف کو زبانی یاد کر لیں اور برابر اس کی تلاوت جاری رکھیں، مختلف مقامات کی مسجدوں میں آپ نمازیوں کا امام اس شخص کو بناتے تھے جسے قرآن شریف پورا یا زیادہ حصہ حفظ ہوتا خواہ وہ نوعمر اور کم سن ہی کیوں نہ ہوتا۔

قرآن شریف چونکہ مجموعی طور پر ایک دفعہ نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا اور اسلام کے تمام بنیادی احکام بھی ایک دفعہ فرض نہیں ہوئے اس لیے یہ احکام قرآن شریف کے مختلف پاروں میں بیان ہوئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے بنیادی احکام کو نیز دوسرے احکام کو قرآن شریف کے متعدد پاروں سے اخذ کر کے اپنے مختصر لفظوں میں بطور خلاصہ کے بیان فرمایا تاکہ ارکان اسلام اور تمام اہم اسلامی

مسائل کو زبانی حفظ کرنے میں آسانی ہو مثلاً اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کلمۂ توحید، نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کی تعلیم کو اس طرح بیان فرمایا۔

عن ابن عمرؓ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خمس شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ ۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے (۱) اس امر کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں (۲) نماز پڑھنا (۳) زکاۃ دینا (۴) حج کرنا (۵) اور رمضان کے روزے رکھنا۔

آپ نے ان چند مختصر جملوں میں اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو اس خوبی اور خوبصورتی سے بیان فرما کر اُمّتِ مسلمہ کو تعلیم دی ہے کہ اُن کا زبانی یاد کر لینا آسان ہوگیا۔ پھر دوسرے موقعوں پر ان ارکان اور دیگر اسلامی مسائل کی فضیلتیں اور خوبیاں بھی بیان فرمادی ہیں تاکہ مذہبی علوم کے حاصل کرنے والے افراد مسائل کی تفصیلات سے مستفید ہو کر اپنی معلومات میں اضافہ کر کے عوام کی صحیح رہنمائی کریں ۔ آپ کے مخاطب صحابہ جو تلامذہ کی حیثیت سے تعلیم حاصل کر رہے تھے اُن کی تعلیم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح انجام دی کہ وہ آئندہ دنیا کے لوگوں کے سامنے سچے اور مخلص معلّم اور رہنما بن کر نمایاں ہوں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا مرکزی محور یہ تھا کہ توحیدِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ کی تعلیم کو سب سے مقدم رکھ کر قومی، ملّی اور مذہبی امور میں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کی روح ہمیشہ کارفرما رہے، اس لیے آنے والے زمانے میں ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے خواہ اُن کی مقامی کوئی زبان ہو، کلمۂ توحید اور نماز کو جو اسلام کے اہم اور سب سے بڑے ارکان میں سے ہیں اُن کی ادائی کے لیے عربی زبان کو جو قرآنی زبان ہے ضروری قرار دیا، ایامِ حج کے موقع پر دنیا بھر کے مختلف زبانوں کے بولنے والے مسلمان ایک ہی زبان عربی میں لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کی صدا بلند کرنے اور عربی ہی زبان میں اللہ کی کتاب قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی تعلیم دی۔ نماز میں تمام مقتدیوں کو

قیام و قعود، رکوع و سجود میں اپنے امام کی اتباع کی تعلیم دی، حج کے موقع پر ایک ہی سفید رنگ کے احرام میں سب کو ملبوس ہونے کا حکم دیا، ایک ہی معبود اللہ، ایک ہی کتاب، کتاب اللہ (قرآن مجید) ایک ہی رسول، محمد رسول اللہ، ایک ہی قبلہ کعبۃ اللہ پر قائم رہنے کے لیے روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو تعلیم دی۔ قرآن شریف کی آیت اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں کا شیریں پیام سُنا کر تمام جہان کے مسلمانوں کو باہم متحد رہنے، افتراق سے بچنے، خندہ پیشانی سے باہم ملنے اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کی تعلیم دی، آپ نے مسلمانوں کو باہمی سلوک کے سلسلے میں یہ تعلیم دی اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ، مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے تمام مسلمان محفوظ ہیں۔

نیز آپ نے یہ تعلیم دی:-

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (۱)

اس وقت تک کوئی شخص سچا ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لیے (بھی) وہ بات پسند نہ کرے جس کو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اور آپ نے یہ تعلیم دی:

سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ (۱)

مسلمانوں کو گالی دینا فسق ہے اور مسلمانوں سے لڑنا کفر ہے۔

آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اثنائے خطبہ میں فرمایا:-

اَىُّ يَوْمٍ هٰذَا؟ اَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ، فَاَىُّ شَهْرٍ هٰذَا؟ اَلَيْسَ بِذِى الْحِجَّةِ، فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِىْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِىْ بَلَدِكُمْ هٰذَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى اَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰى لَهٗ مِنْهُ (۲)

آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا، یہ کون دن ہے؟ کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ (پھر پوچھا) اور یہ کونسا مہینہ ہے؟ کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ پھر آپ نے فرمایا، تمہارے خون اور تمہارے مال، اور تمہاری عزت و آبرو تمہارے درمیان اسی طرح ہیں جس طرح تمہارے اس شہر میں (خونریزی اور آبرو ریزی) حرام ہے حاضر (موجود شخص) کا یہ فرض ہے کہ وہ (یہ خبر) غائب (غیر موجود شخص) کو پہنچا دے اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ حاضر

(۱) زبدۃ البخاری - (۲) زبدۃ البخاری

شخص اس پیام کو کسی ایسے شخص تک پہنچا دے
جو اس سے زیادہ اس کا محافظ ہو۔

آپ نے تعلیم دی کہ دین آسان ہے "الدّین یُسرٌ" اور یہ کہ لوگوں پر آسانیاں پیدا کرو اُن کو مشکلات میں نہ ڈالو یسّروا وَلا تعسّروا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ انفرادی تعلیم بھی اشخاص کے خصوصی حالات کا خیال فرما کر دیتے تھے، اگرچہ یہ تعلیم شخصی ہوتی تھی مگر اس میں بھی عمومی تعلیم کا عنصر شامل ہوتا تھا، یعنی جس طرح یہ خصوصی تعلیم ایک ایک فرد کے لیے مفید ہوتی تھی اسی طرح پوری ملّتِ اسلامی کے تمام افراد کے لیے بھی سُود مند تھی، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

ایک شخص آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں چند بُرے کاموں میں مبتلا رہتا ہوں۔ چوری کرتا ہوں، شراب پیتا ہوں، زنا کا مرتکب ہوتا ہوں، وغیرہ، ان سب کاموں کا ترک کرنا میرے لیے مشکل ہے، کیونکہ میں ان سب کا عادی ہوگیا ہوں۔ مجھے صرف ایک چیز بتائیے جو میں آسانی سے اُس پر عمل کرسکوں۔ آپ نے فرمایا ھَلْ تُعَاھِدُنِی علیٰ تَرْكِ الكِذْبِ؟ کیا تم جھوٹ نہ بولنے کا عہد مجھ سے کرسکتے ہو؟ اُس نے کہا یا رسول اللہ! یہ تو بہت آسان بات ہے میں آپ سے جھوٹ نہ بولنے کا عہد اور وعدہ کرتا ہوں، وہ بہت خوش ہو کر چلا گیا، کہ اللہ کے رسول نے مجھے کسی چیز سے نہیں روکا، سوائے جھوٹ کے جس پر میں آسانی سے عمل کرسکتا ہوں۔ جب رات آئی، وہ حسبِ عادت چوری کے لیے گھر سے نکلا فوراً اُس کے دل میں خیال آیا دربارِ نبوی میں کل حاضر ہوں گا اور مجھ سے پوچھا گیا کہ تم نے رات کیا عمل کیا تھا، اُس وقت اگر چوری کا اقرار کروں گا تو چوری کی تعزیر اور سزا میں میرا ہاتھ کاٹا جائے گا، جھوٹ بولوں گا تو عہد شکنی ہوگی اور عہد شکنی میں کبھی نہیں کرسکتا اس طرح وہ چوری کرنے سے باز آگیا، پھر شراب نوشی اور زناکاری کا خیال آیا۔ مگر اپنے دل میں اُس نے کہا کہ حضور نبی اکرمؐ کے سامنے شراب کے اقرار کرنے پر اسّی کوڑے مجھے لگائے جائیں گے اور زناکاری کی سزا میں اقرار کرنے پر سنگسار یعنی پتھر سے مار کے ہلاک کیا جاؤں گا اور جھوٹ بول نہیں سکتا، کیونکہ عہد شکنی ہوگی اور میں اللہ کے رسول کے

سامنے عہد شکنی نہیں کر سکتا، اس طرح وہ اللہ کے رسول کی تعلیم سے جو بہت آسان تھی چوری، شراب نوشی اور زنا کاری کے ارتکاب سے تائب ہو گیا اور سچا پاکدامن مسلمان بن گیا۔

ایک روز آپ کی خدمتِ اقدس میں قریش کا ایک نوجوان آیا اور کہا اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے زنا کاری کی اجازت دیتے ہیں؟ اس سوال پر جو لوگ وہاں موجود تھے اس نوجوان کو جھڑکیاں دینے لگے۔ آپ نے اس نوجوان سے فرمایا، میرے قریب آجاؤ، وہ آپ کے پاس قریب آگیا۔ آپ نے اُس سے پوچھا کیا تم زنا کاری اپنی ماں کے لیے پسند کرتے ہو، اُس نے جواب دیا میں آپ پر قربان ہو جاؤں، میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ تمام لوگ بھی اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔ پھر آپ نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم زنا کاری اپنی بیٹی، اپنی بہن، اپنی خالہ، اور اپنی پھوپھی کے لیے پسند کرتے ہو؟ اُس نے کہا میں آپ پر فدا ہو جاؤں میں اسے بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ تمام لوگ بھی اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔ پھر آپ نے اپنا دستِ مبارک اس نوجوان پر رکھا اور یہ دعا دی اے اللہ! اس کے گناہ کو تو بخش دے اور اُس کے دل کو پاک و صاف کر دے، اور اس کی شرم گاہ کی حفاظت فرما دے، آپ کی تعلیمی ہدایت اور دعا کی برکت سے وہ نوجوان زنا کاری کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوا(۱)۔

آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو نوجوان تھے قاضی بنا کر ملک یمن روانہ کرتے وقت ہدایت فرمائی کہ جب کوئی نزاعی مسئلہ فیصلے کے لیے تمہارے پاس پیش ہو تو پہلے دونوں مخالف فریقوں کے بیانات سُن لیا کرنا تاکہ واقعہ کی حقیقت تم پر واضح ہو جائے اس کے بعد غور و فکر کر کے فیصلے صادر کرنا(۱)۔

حضرت معاذ بن جبل رضؓ کا بیان ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ ذیل باتوں کی انھیں ہدایت کی۔

قال معاذ بن جبل رضؓ اوصانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال	حضرت بن جبلؓ کا بیان ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحسب ذیل باتوں کی، ہدایت کی،

---

(۱) از کتاب اسمٰی الرسالات مولفہ عبدالحمید خطیب۔

یا معاذ! اِنِّیْ اُوْصِیْكَ بِتَقْوَی اللهِ وَ صدق الحدیث و وفاء العَهْدِ، وَ اَدَاء الْاَمَانَة وَ تَرْكَ الْخِیَانَةِ وَ رَحْمَةِ الیَتِیْمِ، وَحِفْظِ الْجَارِ، وَ كَظْمِ الْغَیْظِ، وَخَفْضِ الجَنَاحِ اعشاء السَّلَامِ، وَلِیْنِ الْكَلَامِ وَ لُزُوْمِ الْاِیْمَانِ، والتفقّه فِی الْقُرْاٰنِ، وَحُبِّ الْاٰخِرَةِ، وَالجزع مِنَ الحِسَابِ وَ قَصْرِ الْاَمَلِ، وَحُسْنِ الْاَمَلِ، وَ عِیَادَةِ الْمَرِیْضِ، وَالْاِسْرَاعِ فِی حَوَائِجِ الْاَرَامِلِ وَالضُّعَفَاءِ، وَقَوْلِ الْحَقِّ وَ اَنْهَاكَ اَنْ تَشْتَمَ مُسْلِمًا، وَ تُكَذِّبَ صَادِقًا، اَوْ تُصَدِّقَ كَاذِبًا، او تعصی اِمَامًا عَادِلًا (۱)

فرمایا اے معاذ! ان باتوں کی میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں (۱) تقویٰ الٰہی (۲) صدق مقالی (۳) وفائے عہد (۴) ادائے امانت (۵) ترک خیانت (۶) یتیم پر مہربانی (۷) پڑوسیوں کی نگرانی (۸) غصّے کو دبانا (۹) شفقت کا برتاؤ (۱۰) لوگوں کو سلام کرنا (۱۱) نرم کلامی (۱۲) ایمان کی پابندی (۱۳) قرآن میں تفکر (۱۴) آخرت کی محبّت (۱۵) روز حساب کا خوف (۱۶) اُمید کو مختصر رکھنا (۱۷) اُمید کو درست رکھنا (۱۸) عیادتِ مریض (۱۹) بیواؤں اور ضعیفوں کی ضرورتوں کو جلد پُورا کرنا (۲۰) راست گوئی اختیار کرنا (۲۱) اور تمہیں کسی مسلمان کو گالی دینے کسی سچے آدمی کو جھٹلانے اور کسی جھوٹے شخص کی تصدیق کرنے اور امام عادل کی نافرمانی کرنے سے منع کرتا ہوں

یہ وہ تمام اہم امور ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک مستقل کتاب کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ان امور کو آپ نے نہایت خوبصورتی اور بلاغت سے مختصر سی عبارت میں ظاہر فرمایا ہے جن کا حفظ کرنا اور عمل کرنا مضبوط قوتِ ارادی والوں کے لیے نہایت آسان ہے۔ اُن کے جلیل القدر فوائد سے خدا کی بے پناہ مخلوق بہرہ ور ہو سکتی ہے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قسم کی تعلیمات کا ورود اگرچہ شخصیات پر ہوا تھا مگر اُن کے فوائد عمومی درجہ کے حامل ہیں۔ آپ کی مجالس وعظ میں جہاں مرد ہوتے تھے، خواتین بھی ایک علیٰحدہ گوشے میں شریک رہ کر آپ کی تعلیمات سے فیضیاب ہوتی تھیں، پھر خواتین کی استدعا پر خاص مجلس زنانہ ہفتہ میں منعقد ہونے لگی جن میں مستورات کے عمومی مسائل کے ساتھ اُن کے مخصوص مسائل کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں

(۱) از اسمی الرسالات مولفہ علامہ عبدالحمید خطیب مکہ

عرب کے ان پڑھ لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر علم و اخلاق کے اعلا نمونہ بن گئے اور مختلف علمی و عملی خصوصیات کے حامل ہو گئے، جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ حضرت عمر رضؓ، حضرت عثمان رضؓ، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے اعلیٰ کردار کے جمہوریت پسند عادل فرماں روا پیدا ہوئے، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضؓ، حضرت سعد بن وقاص رضؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت یزید بن ابی سفیان رضؓ جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم سپہ سالار فوج رونما ہوئے جنھوں نے قیصر و کسریٰ کی پُرشوکت شخصی حکومتوں کا خاتمہ کر کے وہاں اسلام کی عادلانہ حکومت قائم کر دی اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے بکثرت اصحاب میں باعمل ارباب علم و فضل جلوہ گر ہوئے جنھوں نے اپنے علم و فضل کی روشنی سے تاریک دنیا کو جگمگا دیا اور حکومتِ الٰہیہ کو آباد دنیا کے وسیع رقبہ پر جاری کر دیا۔ اور اپنے عدل و انصاف سے نوع انسان کے افراد کو سکون و طمانیت کی زندگی بخشی اور امن و خوش حالی کو عام کر دیا۔ یہ سب برکتیں تھیں حضور نبی اکرمؐ کی پیغمبرانہ تعلیم کی جسے آپ نے بحیثیت اللہ کے رسول اور معلّم کے انجام دیا۔

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
بہ حیثیت
محبّ و مونس

تحریر : علامہ عباس محمود العقاد
ترجمہ : حکیم سیّد افتخار حسن ندوی

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جو آدمی مخلوقِ خدا سے محبّت رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہی آدمی لوگوں کی محبّت کا اہل بھی ہوتا ہے اور جب ہی طرفین میں والہانہ صدق و صفا اور بے لوث سچّی محبّت پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ بلا شبہ صدق و صفا پر مبنی تعلقات اس وقت انتہائی وسعت کے ساتھ تکمیل کو پہنچتے ہیں جب ذوقِ سلیم، متانتِ خلق، فطرت وفا اور شفقت اور انسانیت کے بے پایاں جذبات کا وافر حصّہ انسان کو ملا ہو ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ محبّت کرنے والا لوگوں سے اس لیے محبّت نہ کرتا ہو کہ لوگ اس سے محبّت کریں، کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے اس حال میں محبّت کرتا ہے کہ اس میں سلامتِ ذوق کا اس درجہ نقص ہوتا ہے کہ جو لوگوں کو مُحب کی ذات سے برگشتہ خاطر کر دیتا ہے اور لوگوں میں اس کی محبّت کو گھٹا دیتا ہے۔ پھر اتنا ہی کافی نہیں کہ درجۂ صداقت پر گامزن ہونے کے لیے محبّت رکھنے والے انسان میں سلامتِ ذوق کا وجود ہو، کیونکہ گاہے مُحب سلیم الذوق اور محبوب ہونے کے باوجود اس میں خلقِ متین اور جذبۂ وفا کا فقدان ہوتا ہے۔ اس لیے دوستی و محبّت کا قیام و دوام ناممکن ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچّی محبّت و دوستی کا مکمل وسیلہ تو سلامت وجدان، ذوقِ سلیم، خلقِ متین اور زندۂ جاوید جذبۂ صداقت ہی ہو سکتا ہے۔ اور لاریب اس جامع و مکمّل معیار سے صرف سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہی متصف ہیں۔ وہی ان تمام

خصائل پر فائز نظر آتے ہیں، وہی پسندیدہ اور خالص خلق الٰہی کے مظہر صادق اور مثالی نمونہ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

چنانچہ رسول اکرم صلعم مجسم رحمت اور حد درجہ شفیق و مہربان ثابت ہوئے۔ اصلاح معاشرہ کا آپ نے بیڑا اٹھایا اور باوجود طبائع، سن و سال اور مکان و مقام کے اختلاف کے آپ ہمیشہ ہر چھوٹے بڑے سے بے پناہ محبّت فرماتے تھے۔ آپ کی محبّت کا یہ عالم تھا کہ بوڑھے ہو کر بھی تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں آپ اپنی والدہ محترمہ کی قبر پر کھڑے ہو کر اتنا روئے کہ ہم اسے بھلا نہیں سکتے۔ تمام عالم میں انسانی محبّت کا اس سے برتر و اعلا اور کامل و افضل نمونہ کیا ہوگا کہ چالیس سال کی عمر سے متجاوز ہونے کے باوجود آپ کو اپنی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ سے بے پناہ محبّت تھی۔ آپ کا حال یہ تھا کہ جب بھی آپ ان کو دیکھ پاتے تو امی امی کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی تعظیم و تکریم کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے اور چادر بچھا دیتے تھے۔ پھر آپ ان کو اونٹ اور بکریاں اس قدر عنایت فرماتے جو زمانہ قحط میں اُن کو بے فکر و بے نیاز کر دیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے پاس قبیلہ ہوازن کے کچھ لوگ غزوہ حنین کے قیدی بن کر مدینہ طیبّہ آئے جن میں آپ کا رضاعی چچا بھی تھا۔ آنحضرت صلعم نے غایت شفقت کی بنا پر مجاہدین سے قیدی بچّوں اور عورتوں کو رہا کر دینے کی صرف سفارش کی حکم نہیں دیا۔ لیکن جن جن لوگوں کو مجاہدین آزاد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اُن کو آپ نے خود خرید کر آزاد کر دیا۔ اسی طرح ایک عجمی کنیز کی شفقت و محبّت کو بھی آپ تا زندگی نہ بھلا سکے۔ جنھوں نے آپ کو پالا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اُن کے احسان کا بدلہ اس طرح دیا کہ اُن کو ازدواجی زندگی کی مسرّتوں سے متمتع ہونے کے قابل بنا دیا۔ چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا "جو کوئی ایک جنتی عورت سے شادی کر کے خوش ہونا چاہتا ہو وہ اُم ایمن سے شادی کرے"، آپ جب بھی حضرت اُم ایمن کو دیکھ لیتے تو امی امی کہہ کر پکارتے اور اُن سے باتیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر حضرت ام ایمن کو میدانِ کارزار میں فتح یابی کے لیے جناب باری تعالیٰ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان سے اس حال میں دعا کرتے ہوئے دیکھا گیا کہ وہ عجمی ہونے کی وجہ سے یہ نہیں جانتی تھیں کہ دعا کن الفاظ میں کی جائے مگر ایسی گھمسان جنگ کے ہیجان انگیز لمحات میں بھی حضور اکرم صلعم ان کی طرف متوجہ ہو کر بڑے احترام کے ساتھ اُن سے ہم کلام ہوتے تھے۔

آپ کا انسانی جذبہ اس قدر وسیع تھا کہ آپ کی وابستگی آپ کے نفسِ عالی کے ہر وسیلہ صداقت کو بہ درجہ کمال محیط تھا۔ چنانچہ آپ کے صحابہ میں سے کوئی صحابی اگر آپ سے مُلاقات کرتا تو آپ بھی اُس کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور اُس کے پاس سے نہ ہٹتے تھے جب تک وہ خود نہ ہٹ جاتا اور جب کوئی صحابی آپ سے ملتا تو آپ مصافحہ کے لیے اپنا دستِ مبارک بڑھا دیتے اور اس وقت تک ہاتھوں کو نہ کھینچتے تھے جب تک وہ خود نہ کھینچ لیتا آپ اپنے دستِ مبارک کو نہ کھینچتے تھے۔ آپ اپنے اہل وعیال اور بچّوں کے لیے بھی بے حد مہربان تھے۔ چنانچہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو اپنے بچّوں سے لازماً ملتے تھے۔ اسی لیے حدیث نبوی میں آیا ہے۔ من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا" یعنی وہ شخص ہماری اُمّت میں سے نہیں ہے جو ہمارے بچّوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے۔

جہاں تک آپ کی دیانت داری وامانت کا تعلق ہے تو آپ کا کٹّر سے کٹر دشمن بھی آپ کے اس جوہر کو مانتا ہے۔ آپ کے دوستوں اور معتقدین کا تو ذکر ہی کیا آپ کی امانت پر لوگوں کو اتنا اعتماد تھا کہ کفار باوجود عداوت و مخاصمت کے اپنی امانتیں آپ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ یہ امانت ہی تو تھی جو آپ کو مدینہ طیّبہ کی طرف ہجرت کرنے سے اس حال میں روکے رہی جب کہ اذنِ الٰہی کے بعد آپ کی ہجرت ناگزیر ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس جس کی امانت آپ کے پاس تھی جب تک اُس کی واپسی کا انتظام نہ ہو گیا آپ مکّہ سے نہ نکل سکے۔ اس وقت تو ہم آپ ان نازک لمحات کا اندازہ نہیں کر سکتے جبکہ ادائے امانت کی راہ میں دو طرح کی خطرناک پیچیدگیاں سدّ راہ تھیں۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اگر آپ تمام کفار کی امانت ادا کرتے ہیں تو سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ حضورؐ ہجرت فرما رہے ہیں۔ پھر تو کفار آپ کی جان ہی کے درپے ہو جاتے۔ یہ اس لیے کہ مشرکینِ مکّہ کو یہ معلوم تھا کہ محمّد صلعم امانت ادا کیے بغیر مکّہ سے جا ہی نہیں سکتے۔ یہ وہی مشرکین تھے جو بعثتِ نبوی سے پہلے آپ کے بچپن ہی میں آپ کو امین کا لقب دے چکے تھے اور حقیقت میں یہی وہ اوصاف و خصائل ہیں جو ایک داعی و پیغمبر میں ہونے چاہییں اور اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایسے وسیع و عظیم اخلاقی فضائل ہیں جو تاریخِ عالم کی عظیم سے عظیم شخصیتوں میں بھی یکجا طور پر مجتمع نظر نہیں آتے، نہ انبیا میں اور نہ غیر انبیا میں۔ صرف

رسول اکرم صلعم ہی کی ایک شخصیت ہمیں نظر آتی ہے جن کی ذات سے باوجود اختلاف ممالک و اجناس، باوجود اختلاف معاشرہ و ماحول، باوجود اختلافات روایات و رسوم اور باوجود اختلاف اقدار خلق کے اعلا و افضل انسانیت کا مکمل فیض عام اپنے انتہائی بلوغ و ارتقا یافتہ شکل میں تمام اقوام عالم کو بقدر ظرف نصیب ہوا (سچ ہے وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْن ہم نے آپ کو اے نبی تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حکمائے اسلام اس آیت کے لفظ "عالمین" اور سورہ فاتحہ کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کی ہی روشنی میں تو تعدد عالم کے قائل تھے اور یقیناً وہ یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ روئے زمین کے علاوہ اور ستاروں میں بھی آبادی ہو سکتی ہے لیکن آج دنیا یہ سمجھتی ہے کہ یورپ کی ہی یہ انوکھی تحقیق ہے)

سیرت کی کتابوں میں حضرت زید بن حارثہؓ کا مشہور واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ زیدؓ بن حارثہ کو بچپن ہی میں کسی نے وطن سے بے وطن کر دیا تھا۔ شدہ شدہ یہ کسی طرح مکہ پہنچا دیے گئے۔ پھر قسمت کی یاوری سے یہ کشاں کشاں حضور رسالت مآب صلعم کی خدمتِ اقدس میں پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے اور انتہائی جوش عقیدت کے ساتھ آپ کی خدمت کرنے لگے لیکن ان کے والدان کے فراق کو برداشت نہ کر سکے۔ تلاش و جستجو میں سرگرداں و پریشان تھے کہ کسی نے ان کو یہ خبر دی کہ تمہارا لڑکا مکہ میں ہے۔ یہ سننا تھا کہ اُن کا شوق محبت بے تابانہ اُن کو مکہ میں لے آیا لیکن اُن کا عشق رسول اُن کے باپ کے مادی شوقِ محبت پر غالب آ گیا۔ جب رسولِ اکرم صلعم کو حقیقتِ حال کا علم ہوا تو آپ نے زید بن حارثہ کو جن کے دل میں اسلام کی شمع روشن ہو چکی تھی جن کے ذہن و دماغ پر مئے الست کا عرفانی نشہ چڑھ چکا تھا اور جن کی رگ رگ میں محبتِ رسول کی رو دوڑ چکی تھی حضور اکرم صلعم کی جدائی گوارا نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

آنحضرت صلعم کی غایت محبت و اُلفت کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ایک مرتبہ جو بھی آپ کی رفاقت و سرپرستی میں آجاتا، اُس کو مرنے کے بعد بھی آپ کی مفارقت گوارا نہ تھی۔ چنانچہ آپ کے ایک خادم حضرت ثوبانؓ کا یہی حال تھا۔ اُن کو اپنے مرنے کے بعد کے فراقِ رسول کے تصور نے اُن کے جسم و جان کو گھلا رکھا تھا۔ حضورؐ سے اُن کی مفارقت کی فکر نے اُن کو

ضعیف و ناتوان بنا دیا۔ وہ رات دن ملول و رنجیدہ رہنے لگے۔ حضورِ اکرم صلعم نے آخر اُن کے حُزن و ملال کا سبب دریافت کیا تو عرض کیا "یا رسول اللہ! اس دنیا میں جب تک مجھے آپ کا دیدار نصیب ہوتا ہے تو میری طبیعت بحال رہتی ہے اور جس وقت آپ کے دیدار سے محروم رہتا ہوں تو میں اپنے اندر بڑی وحشت و بے قراری محسوس کرتا ہوں اور نڈھال رہنے لگتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میرے اندر شوقِ ملاقات موجزن ہوجاتا ہے، مجھے تو یہی فکر کھائے جاتی ہے کہ اس دنیا میں جب میری یہ کیفیت ہے تو مرنے کے بعد جب میں آپ کو نہ دیکھوں گا تو میری بے کیفی کا کیا عالم ہوگا، کیونکہ میں تو جنّت کے ایک درجہ میں ہوں گا اور آپ جنّت کے اعلیٰ درجات پر فائز ہوں گے جو انبیا کے لیے مخصوص ہیں تو کس طرح مجھے آپ کا دیدار نصیب ہوگا۔" حضرات مفسّرین کرام بیان کرتے ہیں کہ آیت "وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا" (سورہ نساء) کا سببِ نزول حضرت ثوبانؓ کا یہی نادرۂ روزگار واقعہ ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو بھی اللہ اور رسول کی پیروی کرے گا ایسے لوگوں کو ان انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ جنّت میں جگہ ملے گی، جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے اور یہ لوگ کتنے اچھے رفیق ہوں گے) سچ ہے کہ رسول اکرم صلعم کے صحابہ بھی تو آپ ہی کے صبغۃ اللہ میں رنگے ہوئے تھے اور کیوں نہ ایسا ہوتا جبکہ آپ کے صحابۂ کرام آپ کی حدیث لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَ وَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص مومنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے باپ، اپنے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ بڑھ کر مجھ سے محبّت نہ کرے") کے مثالی مصداق تھے۔

دیکھیے کہ جب عالمِ نزع میں اُن کے خاندان والے آہ و بکا میں مصروف ہوتے ہیں تو حضرت بلالؓ یہ دیکھ کر کہتے ہیں "یہ آہ و بکا کیسی؟ میرے لیے تو یہ تصوّر حد درجہ خوش کن ہے کہ کل میں رسول اللہ صلعم اور صحابہ سے جنّت میں ملنے والا ہوں۔"

اب تک ہم نے صرف اس امر کی طرف توجّہ دی ہے کہ انسان اور انسان کے مابین صداقت کا معیار کیا ہے۔ ہم نے اس لحاظ سے زیادہ غور نہیں کیا ہے کہ نبی کے ساتھ مومن کی محبّت کا بلند ترین معیار کیا ہے۔ اب ہم اسی معیار سے مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کے محبّت سے بھرپور

قلوب کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس وقت ہم آپ کے سامنے مسلمانوں کے ایک پُرجوش اور سخت میدانِ جہاد کا منظر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک صحابیہ ہیں جن کو خبر دی جاتی ہے کہ تمہارے خاندان کے فلاں فلاں افراد شہید ہو گئے۔ وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتی ہیں اور کہتی ہیں، مجھے اس کی فکر نہیں، مجھے تو محمد صلعم کی خیریت سناؤ، جن کے لیے میری جان بھی وقف ہے۔ جب اُن کو حضور اکرم صلعم کی خیریت معلوم ہوئی تو اُنھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ اُس محبت و صداقت کے معیاری نمونے ہیں جن کے ماتحت مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں حُسنِ ایمان اور جوشِ عقیدت کے ساتھ رسول اکرم صلعم کی ذات بابرکات پر ایمان لائے تھے۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ کسی اُمت کی بلند ترین شخصیت کا حق یہ بھی ہے کہ اُس ارفع و اعلا شخصیت کے متبعین کی بڑی بڑی شخصیتیں اپنے ہادیٔ افضل کی پرخلوص اطاعت کریں، اور اس اعتبار سے بھی حضورِ پُرنور کی ذات والا صفات میں اتنے معجزات جمع ہو گئے ہیں جن کی مماثلت کسی کی نادر الوجود صداقتیں بھی نہیں کر سکیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ رسولِ اکرم صلعم کے محبوب، صاحب اقتدار اور یگانۂ روزگار صحابہ کرام اسی معیار کے حامل تھے، جن کو ثروت و حسب کی عظمت کے علاوہ وفاداری و جاں نثاری، اولوالعزمی و ہمت اور اصابتِ رائے کی عظمت بھی حاصل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت اسامہؓ بن زیدؓ، حضرت عمروؓ بن عاص، حضرت زبیرؓ و طلحہؓ اور تمام اولین السابقین ان جملہ عظمتوں کے اعتبار سے بڑے سے بڑے مراتب عالیہ پر فائز تھے اور یقیناً جُملہ صداقتوں اور کلی عظمتوں کے باب میں معجزانہ طور پر صحابہ کرام کی ذاتوں میں یہ جملہ عظیم خصوصیات مجتمع طور پر رچ گئی تھیں۔ اُن میں سے ہر فردِ مزکیٰ، حضورؐ انور کے آفتاب عالم تاب سے فیض پا کر دنیا کے سامنے مہ و انجم کی صورت میں ظاہر ہوا اور اُن میں سے ہر ایک، کل معدنِ خیر کے لیے قطب جاذب کا درجہ رکھتا تھا، جن میں قوت و تدبیر، حلم و بردباری، عدل و انصاف، ذہانت و اجتہاد اور جوش شباب کے علاوہ بڑے ماہرانہ تجربوں کے جملہ اوصاف بدرجہ کمال و تمام موجود تھے۔ اُمتِ محمدیہ ان عظیم تر خصوصیات کی اسی لیے مستحق قرار پائی کہ اس اُمت کے رسول کی ذات میں جذبات مودت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے حتیٰ کہ آپ کے نفس عالی مرتبت نے ہر محبت رکھنے والے کو حسب حال اس کا پُورا پُورا حصّہ دیا۔

یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلعم اپنے مخلص رفقا پر بے حد

مہربان تھے یہ اس وجہ سے کہ نورِ عقل اور نورِ بصیرت کے بے بہا خزانے آپ نے اُن کو عطا فرمائے اور یقیناً نورِ بصیرت نورِ بصر سے افضل ہے، کیونکہ نورِ بصر کی نعمت جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ یہی دو ایسی نعمتیں ہیں جو صرف انسانوں کے لیے مخصوص ہیں لیکن رسول اکرم صلعم ان تمام محاسن سے متّصف ہونے کے باوجود آپ اپنے صحابہ کے فضائل کا نہ صرف ذکر فرماتے تھے بلکہ آپ نے اُن کے ذکر کو رفعت و بلندی بھی عطا فرمائی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بابت آپ نے فرمایا کہ "میرے نزدیک جاہ و قدر اور احسان کے اعتبار سے ابوبکر سے کوئی بڑا نہیں ہے۔ جنھوں نے اپنی جان اور اپنے مال سے میری مدد کی اور اپنی بیٹی میرے نکاح میں دیدی۔" حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کی بابت ارشاد ہوا کہ "ابوبکر و عمر کو میرے کان اور آنکھ کا درجہ حاصل ہے۔" حضرت علی کے متعلق فرمایا "علی دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہیں"۔ بعض صحابہ کی شان میں فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھ کو چار اشخاص سے محبت رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اُن میں سے حضرت علی، حضرت ابوذر غفاری، حضرت مقداد اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں"۔ آپ نے مرض موت میں انصار کی بابت فرمایا، "انصار سے خیر کی اُمید رکھو اور اُن کا خاص خیال رکھو، کیونکہ یہ ہمارے ایسے ہمراز ہیں جن کے پاس میں اُترا۔ لہٰذا ان کی خوبیوں کو دیکھو اور اُن کی بُرائیوں کو نظر انداز کردو"۔

علاوہ بریں ہمیں اس جگہ اپنے کشادہ دل رسولؐ کی ان انسانی شفقتوں کو بھی آپ کے علم میں لانا ہے جن کا بدترین دشمنوں کے حق میں بھی آپ کی ذات سے ظہور ہوا۔ بدترین دشمنوں کے معاملات میں آپ کا حال یہ تھا تو مخلص جان نثاروں کے ساتھ آپ کے حسن سلوک کا کیا عالم ہوگا "تاریخ و سیرت کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ جس جس نے آپ کے چراغ زندگی کو گل کرنا چاہا کسی سے آپ نے خون بہا نہیں لیا اور سب کو معاف کر دیا۔ آپ نے ایسے شخص سے بھی درگزر فرمایا جس نے سونے کی حالت میں آپ کو قتل کرنا چاہا لیکن تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آپ کی نرمی و وسعت اخلاق کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ جب تک آپ کے لیے دشمن کی شرپسندیوں سے بچنا ممکن رہتا، جب تک آپ کے لیے حُسن سلوک کی گنجائش رہتی، آپ ہرگز جنگ میں پیش قدمی نہ فرماتے تھے۔ آپ کے حسن سلوک کی انتہا یہ تھی کہ عبداللہ بن اُبَیّ رئیس المنافقین کی پیہم سازشوں اور حد سے زیادہ ریشہ دوانیوں کے باوجود آپ بہ درجہ غایت چشم پوشی فرماتے تھے۔ تاریخ دشمن سے بھی

محبت کرنے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس منافق کا کردار یہ تھا کہ وہ کسی معاہدے پر قائم نہ رہتا اور بار بار عہد شکنی کرتا تھا۔ بظاہر وہ مسلمانوں کا دوست تھا لیکن اپنی خفیہ مجلسوں میں مکر و کید کی اسکیمیں تیار کیا کرتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ آنحضرت صلعم نے اُس کے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے تو اُس کے فرزند نے جو مخلص مسلمان تھے آگے آ کر حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا" یا رسول اللہ سننے میں آیا ہے کہ آپ میرے والد کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو یہ کام آپ مجھ سے لیں۔ خدا کی قسم قبیلہ خزرج والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قبیلہ میں مجھ سے زیادہ اپنے باپ کی عزت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میرے لیے یہ تصور تکلیف دہ ہوگا کہ میرے علاوہ کوئی اور اسے قتل کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مشتعل ہو کر ایک کافر کے خون کا بدلہ ایک مسلمان قاتل سے لے کر دوزخ میں ڈالا جاؤں۔" یہ سُن کر حضور اکرمؐ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور ایسے بدترین دشمن کو نہ صرف معاف فرما دیا بلکہ آپ کی نرمی و تلطف اور حسن سلوک میں پہلے سے اور اضافہ ہو گیا آپ نے اس منافق کے مرنے پر اُس کے مسلمان فرزند کو اپنی قمیص مبارک عطا فرمائی تاکہ وہ اس سے کفن کا کام لیں، یہی نہیں بلکہ آپ نے اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی اور اُس کی قبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے چاہا بھی کہ ایسے منافقِ اعظم کی نمازِ جنازہ آپ نہ پڑھائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کلام مجید کی اس کے بارے میں یہ آیت پڑھی۔

" ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم" (سورہ توبہ۔ ترجمہ: آپ منافقین کے لیے دعائے مغفرت کریں یا نہ کریں آپ اگر ان کی مغفرت کے لیے ۷۰ مرتبہ بھی دعا کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہ فرمائے گا) یہ سُن کر آپ نے فرمایا" اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے کہ ستر مرتبہ سے زیادہ دعائے مغفرت کرنے پر اس کی بخشایش ہو جائے گی تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کو تیار ہو جاؤں۔"

یہاں یہ اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ رسول اکرم صلعم کی ذات اقدس پر بعض متعصب یورپین مورخین نے آپ پر ظلم و سنگدلی کی جو تہمت لگائی ہے وہ بڑی حیرتناک جسارت ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آج کسی جج کو محض اس بنا پر موردالزام ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ وہ فتنہ پردازوں اور تشدد پسندوں کے لیے یا کسی قاتل کے لیے سزائے موت تجویز کرتا ہے؟ یقیناً سوسائٹی کے ایسے شدید بدترین مجرموں کو سزائے موت دینا سوسائٹی کے بے قصور افراد

کے حق میں وسیلہ رحمت و سلامتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو البتہ امن و امان کا خون ہوتا اور ناکردہ گناہوں کا خونِ ناحق ہوتا۔ اس لیے کلام الٰہی کا یہ اعلان ہے کہ "الفتنہ اشد من القتل" (سورہ بقرہ۔ ترجمہ: تشدد پسندی اور فتنہ سامانی قتل سے کہیں بڑا جرم ہے) ایک جج کا قاتل کو سزائے موت دینا اگر ضروری ہے تو فتنہ و تشدد پھیلانے والوں کو تو اس سے بھی سخت سزا ملنی چاہیئے۔ کیا ایسے جرائم سے بڑھ کر بھی کوئی جرم ہو سکتا ہے جو سارے عوام کو اپنی لپیٹ میں لے لے؟ یورپین مورخین بھی عجیب ہیں جو سزا کو تو دیکھتے ہیں لیکن ان مفسدانہ جرائم کو نہیں دیکھتے جو مستوجب سزا ہوئے۔ پھر جرائم بھی کیسے جرائم۔ جو حضور اکرم کے علاوہ کسی اور کے ساتھ اگر وابستہ ہوتے تو نہ جانے خون کی کتنی ندیاں بہہ جاتیں۔ کوئی بتائے کہ کفار و منافقین کی ساری ناشائستہ حرکات اور تمام مفسدانہ تحریکات کی بنا اس کے سوا کیا تھی کہ یہ نفوس قدسیہ صرف ایک خدا کی بندگی چاہتے تھے۔ اُمتِ مسلمہ کا صرف قصور یہ تھا کہ یہ اُن کے اخلاق ذمیمہ کو سدھارنا چاہتے تھے۔ کیا اُمتِ محمدیہ کی یہ مساعی جمیلہ تشکر و امتنان کی بجائے ایسی ہی شدید عداوتوں کی مستوجب تھیں؟

اس مقام پر مشرکین و منافقین کی طویل عداوتوں کے تذکرے کو ہم تنگی وقت کے باعث نظر انداز کرتے ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک ایسے واقعے کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو ہر قسم کی فتنہ انگیزی کو محیط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلعم نے اپنے چالیس اور بعض روایتوں کی رُو سے ۷۰ صحابہ کی ایک جماعت کو بغرض تدریس مدینہ سے باہر بھیجا تھا جو سب کے سب بئر معونہ کے مقام پر شہید کر دیے گئے۔ بھلا ان شہدار کا اس کے سوا کیا قصور تھا کہ اہلِ معونہ کی طلب پر وہ صرف اس لیے بھیجے گئے تھے کہ یہ وہاں کے لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیں اور دین کی باتیں سکھائیں۔ ہم آج کی متمدن دنیا اور مہذب سوسائٹی سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ مغربی دنیا کے ۴۰ یا ۷۰ مسیحی مبلغین کو آج اگر وحشی قبائل میں بغرض تبلیغ جانا پڑے اور ان کو ان وحشی قبائل کے ہاتھوں نہایت وحشت و بے دردی کے ساتھ قتل ہونا پڑے جو انسانوں کو کھاتے ہیں تو ایسے غدار و بدعہد قاتلوں سے متعلق اقوامِ عالم کا اس زمانے میں کیا طرزِ عمل ہوگا؟ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ ایسی وحشیانہ و بہیمانہ سرگرمیوں پر سخت سے سخت سزا دینا عین رحمت و عدل اور حق و انصاف ہے۔

آخر میں ہم بدعہدی و غداری کے ایک عظیم ترین واقعہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

یہ واقعہ قبیلہ ہذیل کی عہد شکنی سے متعلق ہے۔ رسول کریم صلعم نے قبیلہ ہذیل کی تعلیم کے لیے چھے اساتذہ کا ایک وفد اُن کے پاس روانہ کیا تھا۔ اس وفد کے ہر فرد کو ماسوا ایک کے شہید کر دیا گیا حالانکہ یہ لوگ نہایت پُرامن طور سے اپنے گھر میں مقیم تھے۔ یہ لوگ کسی کو تعلیم حاصل کرنے پر مجبور بھی نہ کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک صحابی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتفاقاً کسی طرح بچ گئے۔ وہ بحیثیت قیدی مکّہ لائے گئے جن کو صفوان بن اُمیّہ نے اس غرض سے خرید لیا کہ اپنے باپ کے قتل کے بدلے میں اُن کو قتل کرے۔ سو جب وہ سولی پر چڑھائے گئے تو ابوسفیان نے از راہِ استہزا اُن سے کہا، "اے زید قسم کھا کر کہنا کہ تم یہ پسند کرتے کہ اگر اس وقت ہمارے پاس تمہاری بجائے محمدؐ ہوتے اور اُن کی گردن حوالۂ شمشیر کی جاتی۔ اور تم آرام کے ساتھ اپنے گھر میں ہوتے"۔ جاں نثار صحابی کا خلوص میں ڈوبا ہوا جواب سننے کے لائق ہے۔ وہ یوں گویا ہوئے کہ، "واللہ میں یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ میں آرام سے گھر میں بیٹھا ہوتا اور اس وقت میری بجائے محمد صلعم ہوتے۔ ارے تم کیا جانو ہمیں محمد صلعم کو کانٹا چبھنے کی معمولی سی تکلیف بھی گوارا نہیں"۔ یہ سننا تھا کہ ابوسفیان نے بڑی وحشت و حیرانی کے ساتھ چیخ مار کر کہا، "میں نے کسی انسان کو اس شان کا نہیں دیکھا کہ اُس کے ساتھی اُس کے ساتھ اس درجہ محبّت رکھیں جس درجے کی محبّت اصحابِ محمدؐ کو محمدؐ کے ساتھ ہے"۔ سچ فرمایا خداوند قدوس نے "اِنّکَ لعلیٰ خلقٍ عظیم"

(ترجمہ: اے نبی تم یقیناً بڑی اعلا سیرت و اخلاق کے حامل ہو) اس بنا پر کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے:

لا یمکن الثنا کما کان حقہٗ　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اَللّٰھُمّ صَلّ علیٰ سیّدنا محمّد و آلہٖ بقدر حسنہ وجمالہٖ

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ حیثیت شوہر

حکیم محمدّ سعید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانِ کامل تھے۔ آپ کی زندگی کا ہر گوشہ اور آپ کے کردار کا ہر رخ مسلمان کے لیے نمونہ اور اسوہ ہے۔ خدائے بزرگ نے آپ کو انسانوں میں پیدا کیا اور انسانوں ہی کی طرح پیدا کیا اور آپ نے انسانوں کی طرح سے اپنی پوری زندگی گزاری۔ آپ بیٹے بھی تھے اور باپ بھی۔ شوہر بھی تھے اور بھائی بھی۔ عمر میں چھوٹے بھی تھے اور بزرگ بھی۔ آپ نے تجارت بھی کی اور فوجیں بھی لڑائیں۔ محنت کشی بھی کی اور حکمرانی بھی۔ آپ ہر حیثیت سے شاہ راہِ حیات پر ایسے نقوشِ قدم چھوڑ گئے جو قیامِ قیامت تک ہم لوگوں کے لیے نمونہ اور معیار بنے رہیں گے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ — بے شک تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

چنانچہ ایک شوہر اور رفیقِ حیات کی حیثیت سے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا جو کردار ہے وہ ہر شوہر کے لیے ایک نمونہ کا کردار ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے مسلمان شوہروں کے لیے آپ صلعم کے چند احکام سماعت فرمایئے:۔ ارشاد فرمایا

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ (ترمذی دارمی ابن ماجہ) — تم میں سب سے بھلا آدمی وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے لیے بھلا ہو۔

دوسرا ارشاد:

خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ — تم میں سب سے بھلے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بھلے ہوں۔

(ترمذی)

ایک بار ایک ایسے صحابی کو جو زہد و عبادت کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی وجہ سے اپنے "اہل" سے غافل رہتے تھے آپ نے بلوایا اور فرمایا:

وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا — اور تمہاری رفیقہ کا بھی تم پر حق ہے

(بخاری)

صنفِ ضعیف کے حقوق کا سرکار کو کتنا خیال تھا۔ اِس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آپ نے اپنی حیات کے آخری خطبۂ حج میں جن اہم تر مسائل پر احکام و نصائح فرمائے تھے اُن میں عورت کے حقوق کا مسئلہ بھی تھا۔ فرمایا:-

لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی نصیحت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں تم اس کے سوا کسی بات کا حق نہیں رکھتے لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں اگر ایسا کریں تو اُن کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور اُن کو ہلکی مار مارو تو اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر اُن پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو بے شک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں اُن کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں اور ہاں! اُن کا حق تم پر یہ ہے کہ اُن کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو" (ابن ماجہ)

بیوی کے حق کی وضاحت ایک اور موقعہ پر ایک سوال کے جواب میں یوں فرمائی:-

"بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ جب خود کھائے تو اس کو کھلائے جب خود پہنے تو اُس کو پہنائے نہ اُس کے منھ پر تھپّڑ مارے نہ اُس کو بُرا بھلا کہے نہ گھر کے علاوہ (سزا کے لیے) اس کو علیحدہ کرے۔"

(ابن ماجہ)

اختصار کے خیال سے ہم نے یہ چند ارشادات نقل کیے ہیں۔ ورنہ بیویوں کے حقوق کے سلسلے میں آپ کے احکام و ہدایات بکثرت ہیں۔

ایک شوہر کی حیثیت سے حضورؐ کیسے تھے اس کا جواب عرض کرنے سے پہلے ہم یہ سوچتے چلیں کہ ایک اچھے شوہر کے لیے عمومی شرائط کیا ہونی چاہئیں۔

* پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بیوی کے لیے محبّت کوش ہو۔
* دوسری شرط یہ ہے کہ اُس کی ضروریات اور خواہشوں کا حتی الامکان پُورا پُورا خیال رکھے۔
* تیسری شرط یہ ہے کہ جہاں تک اُس کے اصُول اجازت دیں بیوی کی ان فرمائشوں اور خواہشوں کی تکمیل و تعمیل میں سعی کرے جو چاہے خود اس کے مزاج کے خلاف ہوں۔
* چوتھی شرط یہ ہے کہ اگر ازواج ایک سے زیادہ ہوں تو اپنی محبّت، وقت، مال اور توجہات کو ان میں ٹھیک ٹھیک اور عادلانہ تقسیم کرے۔

اب ان شرائط کی روشنی میں شوہر کا ایک مثالی کردار ملاحظہ ہو۔!

جہاں تک شرطِ اوّل یعنی محبّت کوش ہونے کا تعلّق ہے اُس کے لیے تو کچھ سوچنا ہی تحصیل حاصل ہے، کیونکہ وہ پاک ہستی جو سراپا محبّت تھی، محبّت کیش تھی، جس کا پیغام محبّت کا پیغام تھا جس کا مشن محبّت کا مشن تھا جس نے محبّت اور صرف محبّت ہی کے زور پر ساری دنیا کو فتح کیا تھا جسے دوستوں سے ہی نہیں دشمنوں سے بھی محبّت تھی۔ ایسے محبّت کیش کی محبّت کوشیوں کا کیا ٹھکانا ہوگا اور وہ بھی اپنی ازواج مطہرات کے لیے!

آپ نے چھٹی صدی کے عرب کے سے معاشرے میں عورت سے جیسی محبّت کر کے دکھائی اور کرنا سکھائی ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے سیّدنا عمرؓ کا یہ قول سنیے۔

> ہم لوگ اسلام سے قبل عورتوں کو کچھ نہیں سمجھتے تھے اسلام نے عورتوں کے لیے احکام نافذ کیے اور ان کے حقوق مقرر کیے۔
>
> (بخاری)

ان احکام و ہدایات کا کیا اثر ہوا؟ عورت کو کیا کیا حقوق ملے؟ اس کا جواب بھی حضرت عمرؓ اپنے اسی ارشاد کے دوسرے حصّے میں دیتے ہیں:

"ایک بار میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اُس نے بھی برابر کے
جواب دیے۔" (بخاری)

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ انقلابِ عظیم! جانور سے بدتر عورت کا درجہ معاشرے میں کتنا بلند ہو گیا اور ذہن کتنے بدل گئے کہ عورت ڈانٹ سُن کر خود بھی ترکی کا جواب ترکی زبان میں ہی دیتی ہے اور اصل حصّہ اس داستان کا یہ ہے کہ شوہر گھر کی اس "جھڑپ" کا حال باہر کے لوگوں کو خود سُنا رہا ہے شکایتاً نہیں فخر کے لہجے میں!

یہ تو سیّدنا عمرؓ تھے۔ اس سے بھی دل چسپ قصّہ خود آنحضرتؐ کا ملاحظہ ہو۔ عورتوں کے حقوق کے اس داعیٔ اعظم نے اپنی ہر رفیقۂ حیات کو عملاً کتنی آزادی دے رکھی تھی اور کتنے زیادہ حقوق عطا فرما رکھے تھے، صرف دوسروں کو نصیحتوں اور ہدایتوں تک بات ختم نہیں کی تھی خود اپنے گھر میں اس پر عمل کر کے دکھایا تھا۔

ایک بار آں حضرتؐ اپنی حبیبہ سیّدتنا عائشہ سے مصروفِ کلام تھے کسی خانگی اور نجی مسئلے پر گفتگو تھی۔ لے ذرا بڑھ گئی۔ جذبات ذرا تلخ ہو گئے۔ سرکار ایک تو حلیم تھے دوسرے عملاً مساوات کی تربیت کرنی تھی۔ اس لیے طرفین میں سے حضرت عائشہؓ کے ہی الفاظ میں بھی ترشی تھی اور لہجہ بھی بلند تھا۔ میاں بیوی میں بھی یہ کارزار گرم تھا کہ حضرت ابوبکرؓ آ نکلے۔ وہ ادھر سرکار کے جاں نثار تھے تو ادھر حبیبۂ رسول اللہ کے پدر بزرگوار بھی تھے۔ گویا دوچند ذمہّ داری حضرت صدیقؓ نے محسوس کی اور باپ اپنی بیٹی کی سرزنش کے لیے طیش میں آگے بڑھے اور گرجا:

"ہائیں! تو رسول اللہ کے سامنے آواز اونچی کرتی ہے!"

اور ہاتھ بھی بلند کر دیا۔ مگر بیٹی اپنے غضبناک باپ کی سرزنش سے صاف بچ نکلی۔ کس نے بچا لیا حقوق نسواں کے مبلّغِ اعظم بیچ میں حائل ہو گئے تھے۔

صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وسلم!
سلام اُس پر کہ جس نے عورتوں کی دستگیری کی

جناب صدیق کے خشم و غضب کا پارہ کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ چڑھ گیا ہو جس فعل میں اُن کے رفیق و حبیب رسول اللہ حائل و مانع ہوں اُس کی تکمیل کی انھیں کب جرأت ہو سکتی تھی، غضب پر ادب غالب آیا اور صدیق والا مقام واپس لوٹ گئے۔

یوں میاں بیوی کی جنگ بھی اس نئے فریق کے کود پڑنے سے ختم ہوگئی۔ حضورؐ نے فرمایا ہوگا:۔

"کیوں حمیرا! آج تو ہیں نے بچا ہی لیا
ورنہ ابا اچھی طرح خبر لے ڈالتے"

سیدہ حمیرا کھل کھلا کر ہنس دی ہوں گی اور رحمتِ عالمؐ کا قلب مبارک بھی وفورِ مسرت سے لبریز ہوگیا ہوگا۔ کہ دیکھو اللہ کے فضل و کرم سے میرا مشن کس قدر کامیاب ہو رہا ہے۔ یہ صنفِ ضعیف اپنی "خودی" کو پہچانتی جا رہی ہے خود مجھے بھی معاف نہیں کرتی۔

جنابِ صدیق رضؓ چند روز بعد پھر کاشانۂ نبوت پر حاضر ہوئے تو آج رنگ دوسرا تھا۔ مثالی زوج اور معیاری زوجہ آج حسبِ معمول خوش دلی اور خوش مزاجی کی حالت میں تھے جنابِ صدیق رضؓ کے دل کی کلی کِھل اٹھی اور عرض کیا:۔

"میں جنگ میں کود پڑا تھا اب صلح میں بھی مجھے شریک کر لیجیے۔"

سرکارؐ مسکرا دیے اور فرمانے لگے: "ہاں ہاں! ضرور"

سرکارؐ نے صحابہ کو اپنی بیویوں کے حقوق ادا کرنے پر جس طرح بار بار و بتکرار متوجہ فرمایا تھا اُس کے نتیجے میں چند سال کے اندر اندر صنفِ ضعیف کو جو آزادی حاصل ہوگئی تھی اُس کا اندازہ بھی آستانۂ نبوی کے ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ حضورؐ کی ازواج مطہرات کی حضورؐ سے بربنا بشریت کبھی کبھی عارضی کچھ شکوہ بھی ہو جاتا تھا۔ ممکن ہے اس رنج اور شکوے کی کوئی حقیقت اور اساس ہوتی ہی نہ ہو اور یہ "ناز" کا ایک انداز ہی ہوتا ہو، بہرحال ازواجِ مطہرات کبھی کبھی اپنے شکوے کا اظہار حضورؐ سے فرمایا کرتی تھیں۔ یہ اظہار کس شان سے ہوتا تھا یہ بھی سننے کی چیز ہے۔ یہ بھی حضورؐ کی کامل و ہمہ جہتی تربیت کا ایک شاہ کار ہے۔ اِس اندازِ شکایت کی مثال خود سرکار ہی کی زبان مبارک سے سنیے۔ آپؐ نے ایک بار حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا:

"تم مجھ سے برہم ہوتی ہو تو میں سمجھ جاتا ہوں"

جنابِ عائشہ رضؓ نے دریافت کیا: "وہ کیسے؟"

فرمایا:

"جب تم مجھ سے خوش رہتی ہو اور کسی بات پر قسم کھائی ہوتی ہے تو

"محمدؐ کے خدا کی قسم کہتی ہو اور جب مجھ سے خوش نہیں ہوتیں تو "ابراہیم کے خدا کی قسم" کہتی ہو۔

حبیبہ رسول اللہ نے عرض کیا:

"جی ہاں! یا رسول اللہ (میں ناخوشی میں) صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں"

سنا آپ نے! اب بیوی ناخوش بھی ہونا جان گئی ہے اور اس ناخوشی کے برملا اظہار کی جرأت بھی اُس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کیا آپ کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہو رہی ہے۔ اگر چھٹی صدی عیسوی میں پوری دنیا کی اخلاقی و معاشرتی حالت آپ کے سامنے ہے اور اس دور کے عرب کی عورت کی حالتِ زار کا نقشہ آپ بھول نہیں گئے ہیں تو آپ کی حیرت کی کوئی حد نہیں ہوگی۔

فصلوا علیہ وسلموا تسلیما

حضرت عائشہؓ کے اور آں حضورؐ کے سن میں بہت فرق تھا۔ ایک ذہین اور طباع اور پھر کم سن لڑکی کا مزاج، مذاق، رنگِ طبیعت، اندازِ فکر، دلچسپیاں غرض ہر چیز ایک پختہ عمر، سنجیدہ، متین، ثقہ اور ذمّے دار شوہر سے مختلف ہونی ہی چاہیئے اور پھر شوہر سرکار کا سا، جن کے دوش پر ساری دنیا کی قیادت کا بار تھا، جن کے دل میں ساری انسانیت کی اصلاح کا جذبہ تھا جن کے ذہن میں عالم کے ایک نئے اور عظیم تر انقلاب کے منصوبے پرورش پا رہے تھے جن کو شوق تھا آدمی کو انسان بنانے کا جن کو فکر تھی نئے خطوط پر تشکیلِ جدید کی۔ مختصر یہ کہ آں حضرتؐ کی دلچسپیاں حضرت عائشہؓ کی دلچسپیوں سے جُدا نوعیت کی تھیں یا یوں کہیئے کہ اُن کے مزاجوں میں اتنا ہی بعد تھا جتنا بڑھاپے اور جوانی میں بُعد ہوتا ہے لیکن دوسروں کے جذبات کا پاس کرنا بھی تو آپ سکھانا چاہتے تھے دوسرے کی جائز خواہشوں کو حتی الامکان پُورا کرنا بھی آپ ضروری سمجھتے تھے۔

عید کا دن تھا۔ چند حبشی باشندے حرم نبوی کے قریب ایک تماشہ دکھا رہے تھے بتقاضائے عمر جناب صدیقہ نے یہ تماشہ دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی سرکارؐ دروازے میں کھڑے ہو گئے اور اُم المومنین حضورؐ کے دوشِ مبارک پر ٹھوڑی رکھ کر تماشہ دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں۔ ایک بار دریافت فرمایا، "کیوں حمیرا! جی نہیں بھرا؟"

حبیبہ رسول اللہؐ نے بے تکلف انکار فرما دیا۔

"ابھی نہیں بھرا"

چنانچہ آپ یونہی کھڑے رہے یہاں تک خود جناب صدیقہ تھک کر ہٹ گئیں!

ازدواج کے ابتدائی زمانے میں تو آستانۂ نبوی میں جناب صدیقہ کی بہت ہی کم سن سہیلیاں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ سرکار اندر تشریف لاتے تو وہ بھاگ جاتیں مگر آپ ان کو بُلا لیا کرتے تھے۔

ابتدائی زمانے میں ہی حضرت صدیقہ گڑیاں تک کھیلا کرتی تھیں۔ آپ نہ صرف اس کھیل میں حارج و مانع نہیں ہوتے تھے بلکہ کبھی کبھی کسی کھلونے کے متعلق کوئی سوال بھی فرما لیا کرتے تھے اور بھول پن کا کوئی جواب سُن کر مسکرا دیتے۔

شادی کے چند دن بعد ایک بار خود آنحضرتؐ کی تحریک پر دونوں میں دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ چھریرے بدن کی تھیں آگے نکل گئیں۔ بہت دن بعد جب سیدہ کا عمر کے ساتھ بدن بھی بھاری پڑ گیا تھا ایک بار پھر دوڑ ہوئی اب کے میدان حضورؐ کے ہاتھ رہا۔ حضورؐ نے پہلا مقابلہ یاد دلا کر فرمایا "آج اس دن کا بدلہ ہو گیا"۔

ایک عید کا دن تھا۔ حرم نبوی میں کچھ بچیاں جمع ہو کر کچھ گانے لگیں۔ آپ لیٹے ہوئے تھے منہ ڈھانک لیا۔ لڑکیاں گاتی رہیں اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آ گئے اور لڑکیوں کو ڈانٹنے لگے تو آپؐ نے روک دیا۔

"اِن بچیوں کو گانے دو یہ اُن کی عید کا دن ہے" (بخاری)

ایک بار سفر میں ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں۔ ساربانوں نے اونٹوں کو دوڑانا شروع کیا تو آپ کو خواتین کا خیال آ گیا۔ اور ساربانوں سے فرمایا۔

"ذرا دیکھ کر! یہ (عورتیں) آبگینے (بھی ساتھ) ہیں" اور سچ ہے کہ سیرت مبارکہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے اِن آبگینوں کی نزاکت کا پُورا پُورا خیال رکھا۔ صنفِ لطیف کے مزاج کی نزاکت کا آپ نے ہر ہر قدم پر ہر ہر بات میں اسی طرح لحاظ فرمایا۔

بے شک حضور صلعم ایک مثالی شوہر تھے۔

صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلّموا تسلیمًا۔



ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن - کراچی
پاکستان